وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے، خیر و برکت والی ہے

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

اردو ترجمانی

از ظہور الباری اعظمی

ناشر

بیت الحکمت دیوبند (یوپی)

اردو زبان میں حدیث کی عظیم المرتبت کتاب صحیح بخاری کی کامل و مکمل شرح موسومہ

انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری

مع مکمل عربی متن و اردو ترجمہ

مرتبہ مولانا سید احمد رضا صاحب (فاضل دیوبند) تلمیذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب محدث کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز

"چودہ سو سال بعد 'آفتاب نبوت کی کرنیں' احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ کی ضیا پاشیاں نئے انداز میں"

دین اسلام کی پوری عمارت دو مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے قرآن مجید اور حدیث صحیح ۔ اور جس طرح ہر دینی یا دنیوی قانون کے لئے توضیحات و تشریحات کی ضرورت ہے قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کی شرح و تفسیر کی بدرجہ اولیٰ ضرورت تھی ! عربی، فارسی، اردو اور دنیا کی دوسری زبانوں میں قرآن مجید کی سیکڑوں تفاسیر و تراجم لکھے گئے، اسی طرح کتب حدیث کی بھی عربی و فارسی وغیرہ زبانوں میں صدہا شروح تصنیف ہوئیں، مگر اردو کا دامن حدیث کی کما حقہ اس خدمت سے خالی تھا۔ اسلام کا مکمل قانون دینی و دنیاوی زندگی میں قرآن مجید کی جہانتاب روشنی کے بعد حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تنویر ہے جس میں مسائل فقہیہ کے علاوہ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، انسان کی دینی و دنیوی زندگی کے تمام مسائل غرض پورے اسلامی معاشرے کی مکمل و صحیح ترین تصویر سامنے آجاتی ہے۔ پھر فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند پایہ احادیث کو امام بخاریؒ نے جس حسن و خوبی اور صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب فرمایا ہے اس کی نظیر اول و آخر میں نہیں ہے۔ اسلئے ہم نے خالص دینی و علمی نقطۂ نظر سے کتاب بخاری کی اردو تشریح کا نیا باب کھولا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان تشریحات میں آپ کو حدیث رسولؐ کی اصل عظمت محسوس ہوگی، دور حاضر کے تمام مسائل اور الجھنیں اس طرح حل نظر آئیں گی کہ حدیث زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرما ہو۔ فقہیات کا تمام مجموعہ احادیث رسولؐ کا ایک عطر محسوس ہوگا۔ فرق باطلہ کیلئے یہ مجموعہ ایک صاعقۂ محرقہ ثابت ہوگا۔ إن شاء الله تعالى.

ایک نسخۂ شفاء :- مصائب و مشکلات کے وقت تمام علماء اسلام نے بخاری شریف پڑھنے کا معمول رکھا ہے، اور یوں بھی پڑھئے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ہم کلامی کی برکت حاصل ہو، سنئے تو مبارک ارشادات کے انوار سے منور ہو جئے گھر میں رکھئے تو خیر و برکت کا عظیم سرمایہ، دین و دنیا کی سب سے بڑی عزت و سعادت اور قابل فخر دولت۔

چند دیگر خصوصیات

(1) بخاری شریف کا پورا متن اعراب کیساتھ عربی خط میں، اور اردو ترجمہ و تشریحات عمدہ نستعلیق خط میں ہوں گی۔ (2) بخاری شریف کی قدیم شروح فتح الباری، عمدۃ القاری، ارشاد الساری، تیسیر القاری وغیرہ سے اہم مباحث وضاحت کے ساتھ درج ہوں گے (3) اپنے اکابر حضرت گنگوہیؒ، شیخ الہندؒ، حضرت مولانا مدنیؒ کی تقاریر درس ترمذی و بخاری کے افادات علمیہ شامل ہوں گے (4) محدث یگانہ علامۂ عصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مطبوعہ تقاریر درس ترمذی و بخاری و ابوداؤد، ملفوظات عالیہ اور غیر مطبوعہ تقاریر درس بخاری شریف کے وہ مضامین عالیہ بھی درج کئے گئے ہیں جو مرتب موصوف نے بزمانۂ قیام جامعہ ڈابھیل حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر کئی سال تک قلمبند کئے تھے (5) اور علامہ عثمانیؒ کی فتح الملہم شرح مسلم کی گرانقدر علمی تحقیقات اور حدیثی تشریحات کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے (6) مختلف فیہ مسائل پر حنفیہ کی طرف سے دلائل و جوابات کا قابل قدر ذخیرہ پیش ہوگا جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے قلمی حواشی آثار السنن مسمیٰ الاتحاف سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

حضرت اقدس مجدد صاحبؒ اور دوسرے اکابر امت کے افاضات بھی موقع بموقع درج ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

لائحہ عمل اور ضروری باتیں

(1) پوری کتاب کے تقریباً آٹھ ہزار صفحات ہوں گے، خریداروں کی سہولت کے خیال سے بالاقساط شائع کی جا رہی ہے

(2) یہ مجموعہ تقریباً چالیس حصوں میں شائع ہوگا جس کے پہلے دو حصے ۵۰۴ صفحات کے بطور مقدمہ شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں ۱۴ صدی کے سات سو محدثین کے گراں قدر علمی حالات و حدیثی خدمات مذکور ہیں۔ تیسرے حصہ سے بخاری شریف کی بے نظیر مبسوط و مکمل شرح اردو میں سہ ماہی پروگرام کے تحت اشاعت پذیر ہے، جو علماء، طلباء، جدید تعلیم یافتہ اور عام مسلمانوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

(ھدیہ) مقدمہ کی ہر دو جلد آٹھ روپے آٹھ آنے۔ باقی ہر حصہ تین روپے آٹھ آنے۔ لیکن ممبران ہند و پاک کے لئے (جو ایک روپیہ فیس ممبری آٹھویں حصہ کی اشاعت سے قبل جمع کر دیں گے)، ہر حصہ غیر مجلد ۲۰۰ / ۳۰۰ دو سو صفحات کا ڈھائی روپے میں ہوگا (علاوہ محصول ڈاک)، جو حضرات مکمل کتاب غیر مجلد مع محصول ڈاک و رجسٹری کے لئے ڈیڑھ سو روپے، مجلد کے لئے دو سو روپیہ جمع کریں گے۔ وہ اس عظیم حدیثی خدمت کے معاونین شمار ہوں گے۔

مکتبہ ناشر العلوم، بجارہ روڈ، بجنور (یوپی)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ

تفسیر ابن جریر

اردو

تالیف

امام ابوجعفر محمد ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ قرآن پاک

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

جز ۴

مکتبہ عثمانیہ 2280

پیر الٰہی بخش کالونی کراچی 5

شائع کردہ

بیت الحکمت دیوبند (یو۔پی)

(قیمت دو روپے)

Marfat.com

DATA ENTERED

13398

احوالِ واقعی

خدائے کائنات کا کس زبان سے شکر ادا ہو کہ آج قارئین کی خدمت میں "ابن جریر" کے اردو ترجمہ کا چوتھا جزء پیش کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ ہم نے اس اہم خدمت کا منصوبہ اسی منعم حقیقی کے فضل و کرم کے یقین پر بنایا تھا اور اسی کی رحمت ہے کہ آج ہمارے قدم اس منزل پر ہیں ــــ!

تفسیر ابن جریر ایک اہم اور طویل تفسیر ہے جس پر تمام تفاسیر کی بنیاد قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی طول وطویل تفسیر کو اردو میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ پھر ہمارے پیش نظر صرف اردو ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ احادیث اور اس کے ماخذ کی چھان بین، جابجا مختصر مگر جامع نوٹ، ادبی محاورات و لغات کی تحقیق بھی ہے۔ اس لیے ان مراحل میں جو محنت، وکاوش اور عرق ریزی کرنا پڑتی ہے اس کا اظہار بھی دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارہ کا معینہ مدت پر آپ کے ہاتھوں میں پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے اگر وقت پر ہم ان مراحل سے گذرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو پھر بھی کوئی نہ کوئی وجہ ایسی پیش آجاتی ہے۔ مثلاً کتابت کا مرحلہ، کاتبوں کی نایابی، کاغذ کی فراہمی وغیرہ جس کی بنا پر ہماری کوششوں کا قافلہ اپنی منزل پر دیر سے پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے کہ ناظرین کرام ہمیں لکھتے رہتے ہیں کہ ہر قسط میں ایک پارہ مکمل شائع کرنے کا وعدہ تھا۔ مگر اب تک کسی قسط میں مکمل ایک پارہ نہ آسکا، اس سلسلے میں ہم ابن جریر کی تیسری قسط میں اعلان کر چکے ہیں کہ ابن جریر ایک طویل تفسیر ہے۔ خصوصاً سورۂ بقرہ کی تفسیر بعض خصوصیات کی بنا پر بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس لیے شروع کی تفسیر مکمل ایک پارہ کی ہمارے مقررہ تقریباً سو صفحات (جن کی ہم نے پروگرام کے اعلان و اشاعت کے وقت وضاحت کر دی تھی) میں آنا ناممکن ہے۔ پھر بھی کوشش یہی رہتی ہے کہ ہر جزء میں زیادہ سے زیادہ تفسیر آجائے۔ انشاء اللہ پانچ چھ پاروں کی تفسیر کے بعد آپ کو مکمل ایک پارہ ہر قسط میں روانہ کیا جا سکے گا۔ ابتدائی پروگرام میں بجائے جزء کے پارہ کا ذکر ہے۔ اس سے مراد وہی ۹۰ صفحات کا جزء تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انھیں مقررہ صفحات میں پورا پارہ آجائے جس کی کوشش بہرحال ہے۔ لیکن سردست ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ جلد بازی سے کام لے کر ہمارے اس عظیم اور خالصۃً لوجہ اللہ مقصد کو ناکام نہ کریں ــــ بعض خریدار وی۔پی واپس کر کے ادارہ کی سخت حوصلہ شکنی کرتے ہیں جس کا ادارہ کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ہم آپ کو بتائیں گے کہ اس کام میں کوئی مالی نفع حاصل نہیں ہے۔ اس پر یہ نقصان کہیں ہماری ہمتیں پست نہ کر دے اور اس طرح قرآن حکیم کی خدمت کا یہ مقدس جذبہ فنا نہ ہو جائے۔ مؤدبانہ گذارش ہے کہ جو حضرات خریداری سے دستبردار ہونا چاہیں وہ براہ کرم پارہ کی ترسیل سے پہلے ہی ایک کارڈ لکھ کر مطلع کریں تاکہ ان کی خدمت میں پارہ ارسال نہ کیا جائے۔ نیز خالص دینی جذبہ رکھنے والے احباب سے پرزور اپیل ہے کہ وہ اس مقدس دینی خدمت میں ہمارے ساتھ تعاون و اشتراک فرمائیں۔ قرآن حکیم کی اشاعت و تفسیر کی خدمت میں تعاون انشاء اللہ العزیز آپ کے لیے اجر عظیم کا باعث ہوگا۔

نیازمند منیجر

Marfat.com

فہرست مضامین تفسیر ابنِ جریرؒ جزء چہارم

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	پارہ سیقول	۵
۲	کم عقلی کی ایک اور مثال	۵
۳	امتِ مسلمہ کی خصوصیت	۸
۴	آزمائش بھی مقصود ہے	۱۲
۵	آں حضورؐ کا انتظار و اشتیاق	۱۶
۶	ضد اور عناد کا کوئی علاج نہیں	۱۸
۷	شبہ تک نہیں	۱۹
۸	ہر قوم راست روا ہے	۲۱
۹	حضور اکرمؐ کی بعثت اور اس کا مقصد	۲۴
۱۰	صبر و نماز کی تلقین	۲۶
۱۱	آزمائش ہوگی	۲۷
۱۲	اللہ کے شعائر	۲۹
۱۳	حق چھپانے والوں کا حشر	۳۲
۱۴	کفر پر مرنے والوں کا حشر	۳۵
۱۵	کائنات کی شہادت	۳۷
۱۶	جب عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے	۴۰
۱۷	کشمکش کا عالم	۴۱
۱۸	حلّت و حرمت اللہ کے حکم پر موقوف ہے	۴۵
۱۹	سوچنے کا غلط انداز	۴۶
۲۰	یہودیوں کی مثال	۴۷
۲۱	مسلمانوں سے خطاب	۴۸
۲۲	شوخ چشمی	۵۱
۲۳	طاعت کیا ہے؟	۵۴
۲۴	قصاص اور اس سے متعلق احکام	۵۷
۲۵	مصالحت کے بعد	۵۹
۲۶	وصیت کے احکام	۶۲
۲۷	روزے کے احکام	۶۵
۲۸	بابرکت مہینہ، اس کے فرائض اور رخصتیں	۷۰
۲۹	میں اپنے بندوں کے قریب ہی ہوں	۷۶
۳۰	روزہ کے مسائل	۷۸

پاکستانی خریدار

پارہ کی قیمت معہ ڈاک خرچ وفیس ممبری جو تین روپیہ ہوتی ہے۔ سوا روپیہ پارہ کی قیمت، بارہ آنے ڈاک خرچ اور ایک روپیہ فیس ممبری) حضرت مولانا محمد صاحب انوری لائلپوری مکان نمبر ۱۲۲ سنت پورہ مین بازار لائل پور (مغربی پاکستان)، کو بھیج کر ڈاک خانہ کی رسید ہمیں دیوبند روانہ کردیں۔ پارہ ان کی خدمت میں روانہ کردیا جائے گا۔ اب تک چار جزء شائع ہو چکے ہیں۔ چاروں جزء طلب کرنے والے حضرات ساڑھے سات روپے کا منی آرڈر مولانا موصوف کو روانہ کردیں۔

منیجر
بیت الحکمت دیوبند (یوپی)

Marfat.com

مدرسہ و خانقاہ کی رفعتوں سے

ابن جریر اردو پر کامل اعتماد

جذبات فخر و تشکر کے ساتھ، یادگار سلف، فخر روزگار، حضرت الشیخ مولانا فخر الدین صاحب دامت برکاتہم مسند آرائے محفل حدیث دار العلوم دیوبند، و پیشوائے بزم سیاست دین جمعیۃ العلماء ہند کی وہ گرامی قدر رائے پیش کی جا رہی ہے جو آپ نے ازراہ ذرہ نوازی ابن جریر اردو پر ظاہر فرمائی، ایک ادنیٰ تلمیذ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہوگی کہ قابل فخر استاد، اس کی حقیر کوششوں کو بنظر استحسان دیکھے۔ متعنا اللہ بطول حیاتہ۔ ظہور الباری اعظمی

امّا بعد!: اس وقت احقر کے پیش نظر "تفسیر ابن جریر اردو" کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ ترجمہ مولانا ظہور الباری اعظمی فاضل دیوبند کے رشحۂ قلم کا نتیجہ ہے۔ ماشاء اللہ ترجمہ عام فہم سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اس ترجمہ میں ہر ہر آیت کے متعلق اقوال سلف کے ساتھ علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے جو شہادتین محاورات عرب کی پیش فرمائی ہیں بالاختصار ان کے سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ نقل احادیث میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اصل احادیث کا کوئی ضروری حصہ رہ نہ جائے۔ اسانید میں صرف منتہاء سند کے رواۃ کے نام ذکر کر دیئے گئے ہیں، اور ایک ہی مضمون کی متعدد احادیث میں امام ترمذیؒ کے طریق کا اتباع کرتے ہوئے ایک دو حدیث کو پورے ترجمے کے ساتھ پیش کر کے بقیہ روایات کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ اور مقصد کے لحاظ سے ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ بہرحال یہ ترجمہ ہر حیثیت سے قابل اعتماد ہے۔ کہیں کہیں مترجم کا نوٹ بھی دیکھنے میں آیا۔ میرے خیال میں جہاں ایسا ہوا ہے وہاں ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا۔

احقر دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم اتمام ترجمہ کی توفیق بخشے اور ترجمہ کو عوام اور علماء میں مقبول بنادے اور مترجم کو اپنے خصوصی انعامات سے نوازے۔ آمین

(حضرت مولانا) فخر الدین احمد غفرلہ

(شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند)

Marfat.com

پارہ سیقول

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا

اب تو (یہ) بے وقوف لوگ ضرور کہیں ہی گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس

عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ

بات) نے بدل دیا　آپ فرما دیجیے کہ سب مشرق اور مغرب اللہ ہی کی ملک میں ہیں　جس کو خدا ہی چاہیں　(یہ)

يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

سیدھا طریق　بتلا دیتے　ہیں۔

کم عقلی کی ایک اور مثال

"سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ" (اب بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے) یعنی لوگوں میں جو جاہل ہیں۔ مراد یہود اور منافقین ہیں۔ انھیں "سُفَهَآءُ" (سفاہت سے، یعنی کم عقل، جاہل) اس لیے کہا گیا کہ اتباع حق کے معاملہ میں انھوں نے کم عقلی اور جہالت کا ثبوت دیا تھا، ہم نے کہا کہ "سفہاء" سے مراد یہود اور منافقین دونوں ہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت سے نقل ہے کہ مراد یہود ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور براء اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول منقول ہے۔ دوسرا قول جو سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے یہ ہے کہ آیت سے مراد منافقین ہیں "مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا" (کس چیز نے ان کو پھیر دیا ان کے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے) "مَا وَلّٰهُمْ" یعنی کس چیز نے انھیں پھیر دیا، یہ "وَلَّانِيْ فُلَانٌ دُبُرَهٗ" (فلاں نے اپنی پشت میری طرف پھیر دی) سے ماخوذ ہے۔ "قِبْلَتِهِمْ" میں "قِبْلَةٌ" کے اصل مفہوم میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جو چہرہ کے سامنے ہو، "فِعْلَةٌ" کے وزن پر "قَابَلْتُ فُلَانًا" سے ماخوذ، یعنی میں اور فلاں آمنے سامنے ہوگئے، اس وقت بولتے ہیں جب دونوں کا چہرہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جائے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "عنقریب جب تم یہود کے قبلہ کے بجائے جو اب تک تمہارا بھی قبلہ رہا ہے، میرے حکم کے مطابق اپنی نمازوں میں چہرہ خانۂ کعبہ کی طرف کرنے لگو گے تو یہ بے وقوف لوگ تم سے کہیں گے کہ اے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والو! تمھیں کس چیز نے نمازیں تمہارے اس قبلہ سے پھیر دیا ہے جس پر تم اب تک تھے اور اب کیوں تم سابقہ قبلہ کے بجائے دوسری طرف رخ کرکے نماز پڑھنے لگے ہو"۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے اس کی خبر دے دی

Marfat.com

ہے کہ جب بیت المقدس کے بجائے اللہ کے حکم کے مطابق تمہارا قبلہ خانہ کعبہ کی طرف پھیر دیا جائے گا جس کا حکم عنقریب ہی نازل ہونے والا ہے، تو یہودی اور منافقین تم پر کس طرح کا اعتراض کریں گے۔ اور پھر اسی آیت میں ان کے اعتراض کا معقول اور مسکت جواب بھی بتا دیا گیا ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ تحویلِ قبلہ کے بعد جب بے وقوفوں کا یہ طبقہ آپ پر اعتراض کرے تو "آپ ان سے کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے"۔

تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدت تک جس کے متعلق ہم آگے روایات بیان کر رہے ہیں، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اب آپ بجائے بیت المقدس[1] کے خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ اسی کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے کہ جب آپ کا قبلہ بدل دیا جائے گا تو یہ بے وقوف لوگ کیا اعتراض کریں گے۔ اور ان کے اعتراض کا جواب کیا ہونا چاہیئے۔ ہجرت کے بعد کتنی مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی؟ اس مدت کی تعیین کے سلسلے میں مفسرین سے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہجرت کے سترھویں مہینے رجب میں قبلہ شام (بیت المقدس) کے بجائے خانہ کعبہ بنا دیا گیا تو رفاعہ بن قیس، قردم بن عمرو، کعب بن اشرف اور نافع بن ابی نافع (یہودی) آئے، یہ نام آپ سے ابن حمید نے نقل کیئے ہیں، آپ سے جو روایت ابو کریب نے نقل کی ہے اس میں رافع بن ابی رافع، کعب بن اشرف کے حلیف حجاج بن عمرو، ربیع بن ربیع حقیق اور کنانہ بن حقیق کے نام بھی لیئے ہیں۔ ان سب نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اے محمد! آپ کو اس قبلہ سے جس پر اب تک آپ تھے، کس چیز نے پھیر دیا؟ وجہ معلوم ہو جائے تو ہم بھی آپ کی اتباع اور آپ کی تصدیق کریں۔ ان کا مقصد صرف آپ کے دین میں فتنہ ڈالنا تھا۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے سترہ مہینے نماز پڑھی آں حضور ص کی خواہش یہ تھی کہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ کو بنا دیا جائے۔ چناں چہ ایک دن ہم (مسجد نبوی کے علاوہ دوسری مسجد میں) نماز (عصر) پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب جنھوں نے آں حضور ص کے ساتھ نماز پڑھی تھی اس مسجد سے گذرے جس میں ہم نماز پڑھ رہے تھے اور کہا، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا ہے۔ بیان کیا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کیئے ہوئے ہم دو رکعت نماز پڑھ چکے تھے ان کی اطلاع پر خانہ کعبہ کی طرف رخ کر لیا گیا اور باقی دو رکعت اس طرف رخ کر کے پڑھی گئی۔ براء رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہجرت کے بعد سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا منقول ہے۔ اس روایت میں ہے کہ جب تحویلِ قبلہ کے متعلق اہل مسجد کو معلوم ہوا تو وہ رکوع میں تھے۔ تمام نمازی خبر سنتے ہی اسی حالت میں سمت بیت المقدس سے سمتِ کعبہ کی طرف پھر گئے۔

مسیب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف سولہ مہینے تک رخ کر کے نماز پڑھی اور تحویلِ قبلہ جنگِ بدر سے دو مہینے پہلے ہوا۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نو یا دس مہینے آنحضور نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ ایک دن مدینہ میں کھڑے آپ ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم ہوا

---

[1] بیت المقدس مدینہ سے شمال کی طرف ہے جب کہ خانہ کعبہ جنوب میں ہے۔

Marfat.com

اور آپ نے اپنا چہرہ نماز ہی میں خانہ کعبہ کی طرف کر لیا۔ اس پر بے وقوفوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد تیرہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھی۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ کی ہجرت سے بھی پہلے سے انصار نے مدینہ میں تین سال تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کے بعد سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔

اس میں بھی مفسرین کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں کہ کعبہ کی طرف نماز میں چہرہ کرنے کی فرضیت سے پہلے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس سبب کی بنا پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس کا آں حضورؐ کو اختیار تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خصوصی حکم نہیں تھا۔ چنانچہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قرآن میں نسخ کے طور پر سب سے پہلے قبلہ کا حکم نازل ہوا تھا، آں حضورؐ صخرہ بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ یہ قبلہ پہلے سے یہودیوں کا چلا آتا تھا۔ آں حضورؐ نے بھی اس طرف چہرہ کر کے نماز اس وجہ سے پڑھنی شروع کی تاکہ یہ لوگ آپ کے قریب آجائیں اور آپ پر ایمان لائیں اور پھر اس کے ذریعہ آپ اَن پڑھ اہلِ عرب کو بھی اسلام کی دعوت دیں۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے آیت نازل کی کہ "اللہ ہی کے لیے ہے مشرق و مغرب، اس لیے جس طرف بھی تم چہرہ کروگے وہیں اللہ کو پاؤگے"۔

ابو العالیہ رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا تھا کہ نماز آپؐ جس طرف چاہیں رخ کر کے پڑھیں، آپؐ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرنا پسند کیا، تاکہ اہلِ کتاب کو اپنے سے قریب لاسکیں۔ سولہ مہینے تک آپؐ کا یہی قبلہ رہا، لیکن آپ اس کے بجائے خانۂ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے حکم کے لیے چہرۂ مبارک بار بار آسمان کی طرف کرتے تھے۔ پھر آپؐ کو اسی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ فرض نازل ہوا تھا۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، علی بن ابی طلحہ آپ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے بیان کیا کہ جب آں حضورؐ مدینہ جہاں یہودیوں کی بھی آبادی تھی، ہجرت کر کے تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ یہودی اس حکم سے بہت خوش تھے۔ آں حضورؐ نے تقریباً دس مہینے اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھی لیکن آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ (خانہ کعبہ) کو پسند کرتے تھے اور اس کے لیے دعا کرتے تھے اور بار بار نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ "بے شک ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا"، (اور قبلہ بدل دیا گیا)۔ یہودیوں کو اس سے شبہ ہوگیا اور کہنے لگے کہ جس قبلہ پر وہ اب تک تھے اسے آخر کس چیز نے بدل دیا۔ زیرِ تفسیر آیت اسی پر نازل ہوئی۔ کچھ اسی طرح کی روایت ابن جریج سے بھی ہے۔ یہودیوں اور منافقوں کا جو اعتراض آیت میں نقل ہوا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں دو مختلف روایتیں ہیں کہ انھوں نے یہ اعتراض کیوں کیا تھا؟ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں نے محض دینِ اسلام میں فتنہ ڈالنے کے لیے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تحویلِ قبلہ کے بعد کہا تھا کہ آپ اپنے سابقہ قبلہ (بیت المقدس) کو پھر اختیار کرلیں تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ کے متبع بن جائیں گے۔ اسی کی حکایت آیت میں ہوئی ہے۔ دوسرا قول وہ ہے جو اوپر علی بن ابی طلحہ کے واسطہ سے نقل ہوا۔

Marfat.com

قتادہ نے فرمایا کہ تحویل قبلہ کے بعد یہودیوں نے آں حضور کے متعلق کہنا شروع کیا کہ معلوم ہوتا ہے اب انھیں اپنے وطن کی یاد زیادہ آنے لگی ہے۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔ سدی سے روایت ہے کہ اعتراض جو آیت میں نقل ہوا ہے وہ منافقوں نے کیا تھا۔ آپ نے بیان کیا کہ تحویل قبلہ کے بعد اسلام دشمن جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف اعتراضات شروع کر دیئے تھے، منافقین نے یہ اعتراض کیا تھا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک زمانہ تک ایک خاص قبلہ کی طرف چہرہ کرکے نماز پڑھی جاتی رہی اور پھر اسے بدل دیا گیا تو آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی تھے[1]۔

"قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (آپ کہدیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، وہ جسے چاہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے)۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو رہا ہے کہ آپ ان معترضین سے کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، یعنی مشرق و مغرب اور ان کے درمیان میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کی ملکیت میں ہے، اللہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور "صراطِ مستقیم" (سیدھی راہ) پر چلاتا ہے۔ اس سے مراد ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ لوگوں کے امام و پیشوا تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے رسوا کرتا ہے اور حق کے راستے سے دور کر دیتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! آپ کہدیجئے کہ خانہ کعبہ کو ہمارا قبلہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے قبلہ ابراہیمی کی طرف ہماری ہدایت کی ہے، اور اے یہودیو، منافقو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والو! تمھیں اللہ نے گمراہ کیا ہے اور نامراد رکھا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ

اور تمہارے لیئے رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں		اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس)

كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى

وہ تو محض اس کے لیئے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ کون تو رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون

عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ

پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے		اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر) ہوا بڑا ثقیل (ہاں)، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع (اور ناقص) کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں

امت مسلمہ کی خصوصیت		"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" (اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک امت

[1] آیت کے الفاظ عام ہیں اور یہود، منافقین اور دوسرے تمام معترضین مراد لیئے جا سکتے ہیں (مترجم)۔

Marfat.com

ابن جریر

جس طرح ہم نے تمھیں قبلہ اور ملت ابراہیمی کی طرف ہدایت دے کر ایک خصوصیت بخشی ہے اور تمام دوسرے دین والوں پر اس باب میں تمھیں فضیلت دی ہے اسی طرح ہم نے تمھیں ایک اور فضیلت اور خصوصیت سے بھی نوازا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے تمھیں "امت وسط" بنایا ہے۔ عادل بنادیا ہے) یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی شریعت پر ایمان لانے والو! امت کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایک دور کے لوگوں اور ایک قسم کے لوگوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسرا لفظ اس ترکیب میں "وَسَطٌ" ہے، کلام عرب میں تعریف کے موقعہ پر بھلائی اور عظمت کے معنٰی میں آتا ہے۔ قوم میں کسی کے حسب ونسب کی نجابت بیان کرنے کے لیے عرب "فُلَانٌ وَاسِطُ الْحَسَبِ فِيْ قَوْمِهٖ" استعمال کرتے تھے۔ "وَسَطُ" یہاں اس جزء کے معنٰی میں آیا ہے جو دو کناروں کے ٹھیک بیچ میں ہوتا ہے، جیسے "وَسَطُ الدَّار" (گھر کا درمیانی حصہ)۔ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالٰی نے امت محمدیہ علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت "وَسَطْ" سے اس لیے بیان کی ہے کہ یہ امت اپنے دین میں غایت اعتدال پر ہوگی، نہ نصارٰی کی طرح ان میں غلو وافراط ہوگا کہ انھوں نے رہبانیت اختیار کرلی اور عیسٰی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا، اور نہ اس امت میں یہودیوں کی طرح عملی کوتاہی اور تفریط ہوگی کہ انھوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف وتبدیلی کرڈالی تھی اور اللہ کے انبیاء کا کفر وانکار کے علاوہ بہت سے انبیاء کو انھوں نے قتل بھی کردیا تھا۔ امت محمدیہ اس طرح کی افراط وتفریط سے پاک ہوگی اور بہت ہی میانہ رو اور غایت اعتدال میں ہوگی۔ میانہ روی اور اعتدال اللہ تعالٰی کو بہت پسند ہے، اس لیے اس خصوصیت کا خاص طور سے ذکر ہوا۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کے معنٰی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "وسطا" کے معنٰی "عدول" (غایت اعتدال میں) ہیں۔ مجاہد، ربیع، عبداللہ بن کثیر رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی معنٰی منقول ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امت محمدیہ کا درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری امتوں کے درمیان میں ہے "لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" (تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر)۔ "شُهَدَاءُ" "شَهِيْدٌ" کی جمع ہے (بمعنٰی گواہ)۔ کہا جارہا ہے کہ ہم نے تمھیں ایک امت عادل بنایا ہے تاکہ تم میرے انبیاء اور رسولوں کے بارے میں اس کی گواہی دو کہ انھوں نے اپنی امتوں کو وہ پیغام پہنچا دیا جس کے لیے میں نے انھیں بھیجا تھا، اور میرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ایمان پر گواہ رہیں۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا آپ نے میرا وہ پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا جسے دے کر میں نے آپ کو بھیجا تھا؟۔ نوح علیہ السلام عرض کریں گے کہ ہاں، میں نے پہنچا دیا تھا۔ پھر آپ کی قوم سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ میرا پیغام لے کر تمہارے پاس آئے تھے؟ قوم صاف انکار کردے گی کہ ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اب نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ اس کے متعلق کون گواہ ہے کہ واقعی آپ نے میرا پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا۔ آپؑ عرض کریں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت۔ اسی کا بیان آیت میں ہے۔

ابو سعید رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں ہے کہ پھر امت محمدیہ بلائی جائے گی اور وہ شہادت دے گی کہ نوح علیہ السلام نے دعوت اپنی امت تک پہنچا دی تھی۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اپنی امت کے ساتھ قیامت کے

Marfat.com

دن ایک ٹیلہ پر ہوں گا اور تمام مخلوق کو اوپر سے ہم دیکھ رہے ہوں گے۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں یہ خواہش نہ پیدا ہو کہ کاش وہ بھی اسی امت کا ایک فرد ہوتا جس نبی کو بھی اس کی امت قیامت کے دن جھٹلائے گی ہم اس کی طرف سے گواہی دیں گے کہ واقعی انھوں نے اپنی قوم کو دعوتِ الٰہی پہنچا دی تھی اور ان کی خیر خواہی کے لیے کوشش کی تھی، فرمایا" اور رسول تم پر گواہ ہوں گے"۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مرتبہ ایک جنازہ کو دفن کرنے کے لیے نکلا۔ نماز جنازہ کے بعد لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ کیا ہی خوب آدمی تھا۔ آں حضورؐ نے فرمایا کہ واجب ہوگئی۔ پھر ایک دوسرے جنازہ کے لیے میں آں حضورؐ کے ساتھ نکلا۔ نماز جنازہ کے بعد میت کے متعلق لوگ کہنے لگے کہ کتنا بُرا شخص تھا۔ آں حضورؐ نے اس مرتبہ بھی یہی فرمایا کہ" واجب ہوگئی"۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ! آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ" واجب ہوگئی"، اس کا کیا مطلب ہے؟ آں حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ" تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر"۔[1]

سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی موقعہ پر فرمایا تھا کہ فرشتے آسمان پر اللہ کے گواہ ہیں اور تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو، اس لیے تم کسی کے متعلق جس چیز کی گواہی دے دو گے اللہ ہی اس کے لیے واجب کردے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی" اور آپ کہہ دیجئے کہ عمل کیے جاؤ، سو تمہارے عمل کو اللہ اور اس کا رسول اور مؤمنین ابھی دیکھے لیتے ہیں"۔ آیت کی تفسیر میں مذکورہ بالا قول، مجاہد، ابو نجیح، عبید بن عمیر اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی اختصار کے ساتھ منقول ہے۔

زید بن اسلم کی روایت میں ہے نوح علیہ السلام کی قوم قیامت کے دن دعویٰ کرے گی کہ نوح علیہ السلام نے اللہ کا پیغام انھیں نہیں پہنچایا تھا۔ اس پر نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیوں، آپ نے اپنی قوم کو میرا پیغام نہیں پہنچایا تھا؟ آپؑ عرض کریں گے کہ یا اللہ، میں نے آپ کا پیغام انھیں پہنچا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آپ کے گواہ کون ہیں؟ عرض کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت!۔ اب امت محمدیہ بلائی جائے گی اور پوچھا جائے گا۔ یہ امت گواہی دے گی کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ قوم نوح کہے گی کہ تمہاری گواہی کس طرح سچی مان لی جائے؟ تم تو ہمارے زمانہ میں تھے ہی نہیں۔ امت محمدیہ کہے گی کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور آپؐ نے ہمیں خبر دی کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی دعوت پہنچا دی تھی۔ اس گواہی کے بعد نوح علیہ السلام کی تصدیق کردی جائے گی اور آپؑ کی قوم کو جھٹلا دیا جائے گا۔ اس کے بعد آں حضورؐ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت کی۔

حیان بن ابی جبلہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جمع کرے گا تو سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام کو بلائے گا اور ان سے دریافت فرمائے گا کہ آپ نے میرے احکام (عہد) کا کیا کیا تھا، کیا انھیں پہنچا دیا تھا؟ وہ عرض کریں گے کہ ہاں، یا اللہ، میں نے جبریل علیہ السلام تک پہنچا دیا تھا۔ اب

---

[1] یعنی صحابہؓ نے جس میت کی تعریف کی تھی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی اور جس کی برائی کی تھی اس کے لیے دوزخ واجب ہوگئی۔ مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کے واقعی متبع ہیں اور صاحب تقویٰ ہیں کہ ع گفتہ او گفتہ اللہ بود۔ یعنی پرہیزگار اور اللہ سے ڈرتے رہنے والے مؤمنین جس کے متعلق اچھائی یا برائی کی گواہی دے دیں تو وہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

جبریل علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا اسرافیل نے آپ کو میرے احکام پہنچا دیئے تھے؟ وہ عرض کریں گے کہ ہاں، اے میرے رب! انھوں نے آپ کے احکام مجھ تک پہنچا دیئے تھے۔ اس کے بعد اسرافیل علیہ السلام کو چھوڑ دیا جائے گا اور جبریل علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ کیا آپ نے میرے احکام پہنچا دیئے تھے؟ وہ عرض کریں گے کہ ہاں، اے اللہ! میں نے آپ کے احکام آپ کے انبیاء تک پہنچا دیئے تھے۔ اب انبیاء علیہم السلام کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا آپ لوگوں کو جبریل نے میرے احکام پہنچا دیئے تھے؟ وہ عرض کریں گے، ہاں، اے ہمارے رب! جبریل علیہ السلام کو بھی چھوڑ دیا جائے گا، اور انبیاء سے سوال ہوگا کہ آپ لوگوں نے میرے احکام کا کیا کیا تھا؟ وہ عرض کریں گے کہ ہم نے آپ کے احکام اپنی امتوں کو پہنچا دیئے تھے۔ امتیں بلائی جائیں گی اور سوال ہوگا کہ کیا تمہاری طرف بھیجے جانے والے انبیاء نے تمھیں میرے احکام پہنچا دیئے تھے۔ ان میں سے کچھ انکار کریں گے اور کچھ تصدیق کریں گے۔ انبیاء عرض کریں گے کہ ہمارے پاس اس کے گواہ ہیں اور وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ ہم نے احکام پہنچانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ پوچھا جائے گا کہ تمہاری طرف سے کون گواہی دے گا؟ انبیاء عرض کریں گے کہ امتِ محمدیہ۔ اب احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا تم اس کی گواہی دے سکتے ہو کہ میرے انبیاء نے میرا پیغام اپنی قوموں کو پہنچا دیا تھا؟ یہ امت عرض کرے گی کہ ہاں، اے ہمارے رب! ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ کے انبیاء نے آپ کا پیغام اپنی قوموں کو پہنچا دیا تھا۔ انبیاء کی منکر قومیں اس پر بول پڑیں گی کہ ہمارے معاملات میں ان کی گواہی کس طرح مان لی جائے گی، یہ تو ہمارے زمانہ میں تھے ہی نہیں! اللہ رب العزت سوال کرے گا کہ ہاں، تم ان لوگوں کے متعلق کس طرح گواہی دیتے ہو جن کے زمانہ میں تم نہیں تھے۔ امت محمدیہ عرض کرے گی کہ اے ہمارے رب! آپ نے ہمارے پاس اپنا رسول بھیجا تھا، اپنی کتاب اور اپنے احکام نازل کیے تھے اور ہمیں بتایا تھا کہ تمام انبیاء نے اپنی قوموں کو آپ کے احکام پہنچا دیئے تھے، ہماری یہ گواہی اسی بنیاد پر ہے۔ اللہ رب العزت فرمائے گا کہ انھوں نے سچ کہا۔ "وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ابن انعم نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت اس دن گواہی دے گی، سوا اس شخص کے جس کے دل میں اپنے کسی بھائی کی طرف سے کینہ ہوگا۔ ضحاک نے فرمایا کہ مراد وہ لوگ ہیں جو ہدایت پر قائم رہے اور یہی لوگ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام کے گواہ ہونگے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امتِ محمدیہ ان تمام لوگوں کے خلاف گواہی دے گی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے، کیونکہ ان کی کتاب میں اس کی تفصیلات ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے حق میں اس کی گواہی دیں گے کہ جب حق ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی اور ایمان لائے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے گواہی دیں گے اور آپ کی امت دوسری تمام منکر امتوں کے خلاف گواہی دے گی۔ یہ امت ان چار گواہوں میں سے ایک ہوگی جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ" (اور اس روز بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے)۔ ایک گواہ فرشتے ہوں گے جو ہمارے اچھے اور برے اعمال کا شمار کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ آیت "وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ" (اور ہر شخص اس طرح آئے گا کہ ایک (فرشتہ) تو اس کے ساتھ ہمراہ لانے والا ہوگا اور ایک (فرشتہ) گواہ ہوگا) میں بیان ہوا ہے۔ آپ نے بیان کیا کہ یہ قیامت کے دن ہوگا۔ دوسرے گواہ انبیاء ہوں گے جو اپنی امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے۔ تیسرے گواہ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہوگی جو تمام دوسری امتوں کے بارے میں گواہی دے گی (اور چوتھے گواہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، آپ اپنی امت کے

Marfat.com

حق میں گواہی دیں گے)۔

آزمائش بھی مقصود ہے

"وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ" (اور جس قبلہ پر آپ اب تک تھے اسے تو ہم نے اسی لیے رکھا تھا کہ ہم پہچان لیں رسول کا اتباع کرنے والوں کو الٹے پاؤں واپس ہوجانے والوں سے)۔ یعنی اے محمد! جس قبلہ پر آپ اب تک تھے اور پھر اس کے بجائے دوسرے قبلہ کا حکم اس لیے ہوا ہے تاکہ ہم جان لیں کہ کون واقعی آپ کی اتباع کرنے والا ہے اور کون نہیں ہے۔ "الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا" یعنی وہ قبلہ جس کی طرف، کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے آپ چہرہ کرکے نماز پڑھتے تھے، مراد بیت المقدس ہے۔ سدی اور عطاء رحمہما اللہ سے اسی کی روایت ہے۔ بکثرت احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ساتھیوں کی آزمائش بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ بنا کر کی تھی۔ اسی موقعہ پر بعض نئے اور کمزور ایمان کے لوگ دین سے پھر بھی گئے تھے اور بہت سے منافقین تحویلِ قبلہ کے بعد اپنے نفاق کا علانیہ اظہار کرنے لگے تھے اور (عام بے اطمینانی پیدا کرنے کے لیے) کہنے لگے تھے کہ آخر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا ہوگیا ہے، کبھی ہمارا چہرہ ادھر کردیتے ہیں اور کبھی اُدھر۔ بعض صحابہ نے اپنے دوسرے ان مسلمان بھائیوں کے بارے میں جو تحویلِ قبلہ سے پہلے انتقال کرچکے تھے، یہ کہا کہ ان کا اور ہمارے بھی اب تک کے اعمال اکارت گئے اور ضائع ہوگئے۔ مشرکین کہنے لگے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دین کے بارے میں خوب سرگردانی کے عالم میں مبتلا ہیں۔ اس لیے تحویلِ قبلہ کا یہ حکم سب ہی کے لیے آزمائش تھا اور مومنین کی ثابت قدمی بھی دیکھنی تھی۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ تحویلِ قبلہ ہم نے اس لیے کیا ہے تاکہ ہم پہچان لیں کہ رسول کی اتباع کرنے والا کون ہے اور الٹے پاؤں واپس ہوجانے والا کون ہے۔ یہ آزمائش اور امتحان کا ایک موقعہ تھا اگر قبلہ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف نہ پھیرا جاتا تو کھرا کھوٹا سب کے سامنے ظاہر نہ ہوتا۔ قتادہ، سدی اور ابن جریج رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔

سدیؒ کی روایت میں ہے کہ تحویلِ قبلہ کے بعد مختلف طرح کے لوگ مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے تھے، منافقین کہنے لگے کہ یہ لوگ بھی عجیب ہیں، کچھ دنوں ایک قبلہ کی طرف چہرہ کرکے نماز پڑھتے ہیں اور پھر کچھ دنوں بعد اسے بدل لیتے ہیں۔ مومنین نے یہ کہا کہ کاش ہمیں اپنے ان بھائیوں کے متعلق معلوم ہوجاتا جو تحویلِ قبلہ سے پہلے انتقال کرگئے ہیں اور انھوں نے صرف بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے، کیا ان کی عبادات اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوئیں یا نہیں؟۔ یہودیوں نے یہ شوشہ نکالا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں اپنے باپ دادا کے شہر کی پھر ہوک اٹھی ہے، اگر وہ ہمارے ہی قبلہ پر ثابت قدم رہتے تو ہم سمجھتے کہ ہاں، واقعی وہ ہمارے وہی صاحب ہیں جن کی بعثت کا ہمیں انتظار تھا۔ مشرکین نے ایک نئی صدا بلند کی کہ محمد اپنے دین کے بارے میں بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں، اب انھوں نے اپنے قبلہ سمیت ہماری طرف رخ کرلیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت پر ہمیں تھے، کوئی حیرت نہ ہوگی کہ اگر وہ ہمارا دین قبول کرلیں۔ اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں، ہر چیز وجود سے بھی پہلے اللہ کے علم میں ہوتی ہے، لیکن آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ تحویلِ قبلہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ہم پہچان لیں کہ کون ثابت قدم ہے اور کون نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے رسول اور ان کے مخلص صحابہ اور میرے اولیاء کھرے کھوٹے کو پہچان لیں۔ اسی مفہوم کی ادائیگی "إِلَّا لِنَعْلَمَ" (تاکہ ہم پہچان لیں) سے کی گئی ہے، یعنی تاکہ ہمارے رسول اور ہمارے اولیاء پہچان لیں، کیوں کہ اللہ کے رسول اور اولیاء اللہ کی جماعت کے افراد ہیں

Marfat.com

اور عرب رہنما اور رئیس کی طرف ان کا اتباع کرنے والوں کے اعمال کی نسبت کرکے بیان کردیتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے کہ "عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سرزمینِ عراق فتح کی"، حالانکہ عراق آپؓ کے بھیجے ہوئے لشکر نے فتح کیا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ لشکر بھیجنے والے آپؓ ہی تھے اور اس طرح فتح کا سبب آپؓ بنے تھے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں بیمار ہوا اور میرے بندے نے میری عیادت نہیں کی، میں نے اس سے قرض مانگا اور اس نے مجھے قرض نہیں دیا، اور مجھے میرے بندے نے گالی دی، حالانکہ اس کے لیے مناسب نہیں تھا کہ مجھے گالی دیتا۔ اسی حدیث کی ایک دوسری روایت میں (گالی دینے کی تشریح بیان ہوئی ہے کہ بندہ کہتا ہے، تف ہے تجھ پر زمانہ! حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے قرض مانگنے اور عیادت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، حالانکہ مراد دوسرے ضرورتمند بندے ہیں، لیکن چونکہ اللہ ہی اس قرض اور عیادت کا سبب تھا اور اسی کا اس سلسلے میں حکم تھا، اس لیے اپنی طرف نسبت کی۔ آیت میں بھی یہی صورت ہے۔ اسی کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے "تاکہ ہم تمیز کردیں، اہل یقین وایمان اور اہل شرک وشک میں۔ بعض مفسرین نے "اِلَّا لِنَعْلَمَ" میں "علم" کے معنی "رویت" (دیکھنے) کے لیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل عرب "علم" کو "رویت" کی جگہ اور "رویت" کو "علم" کی جگہ عام طور سے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحَابِ الْفِیْلِ" (کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں سے کیا معاملہ کیا)۔ یہاں بھی "اَلَمْ تَرَ" میں "تَرَ" (رویت سے) "تَعْلَمْ" کے معنی میں ہے۔ اسی کے مطابق زیرِ تفسیر آیت میں "لِنَعْلَمَ" "لِنَرَیٰ" کے معنی میں ہے، یعنی "تاکہ ہم دیکھ لیں کون رسول کی اتباع کرتا ہے"۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ "رَأَیْتَ، عَلِمْتَ اور شَهِدْتَ" قریب المعنیٰ الفاظ ہیں اور انھیں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ دُور از کار تاویل ہے۔ "رؤیت" (دیکھنے) میں علم لازمی طور پر آجاتا ہے، جب بھی کوئی کسی چیز کو دیکھے گا تو اس کا کسی نہ کسی حد تک علم بھی اسے ہوجائے گا، لیکن علم کے لیے دیکھنا ضروری نہیں ہے، بغیر دیکھے بھی کسی چیز کا علم حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ ہے کہ کلام عرب میں "رویت" علم کے معنی میں تو ضرور استعمال ہوتا ہے، لیکن "علم" رویت کے معنی میں نہیں استعمال ہوتا۔ عربوں سے یہ کسی نے نہیں سنا ہوگا کہ "اَعَلِمْتَ" (کیا تمھیں معلوم ہوا) "اَرَأَیْتَ" (کیا تم نے دیکھا) کی جگہ استعمال کیا ہو۔ البتہ اس کے برعکس "اَرَأَیْتَ" "اَعَلِمْتَ" کے معنی میں وہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے آیت میں بھی "اِلَّا لِنَعْلَمَ" کو "اِلَّا لِنَرَیٰ" کے معنی میں استعمال نہیں کرسکتے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آیت میں "اِلَّا لِنَعْلَمَ" (تاکہ ہم جان لیں) اس لیے استعمال کیا کہ منافقین، یہود اور اہل کفر اسے نہیں مانتے تھے کہ چیزوں کے وجود سے پہلے اللہ کے علم میں وہ ہوتی ہیں۔ تحویلِ قبلہ سے پہلے ہی یہ بتادیا گیا تھا کہ بعض اہل قبلہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے بعد الٹے پاؤں واپس ہوجائیں گے تو ان لوگوں نے کہا کہ جو چیز اب تک وجود میں بھی نہیں آئی ہے اس کا علم اللہ کو آخر کیسے ہوگیا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ لیکن جب قبلہ بدل دیا گیا اور اس کی وجہ سے جنھیں کفر کرنا تھا انھوں نے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور فرمایا کہ ہم نے یہ صرف اس لیے کیا تاکہ تمھیں معلوم ہوجائے کہ چیزیں وجود سے پہلے ہمارے علم میں ہوتی ہیں۔ "اِلَّا لِنَعْلَمَ" کا مفہوم اس صورت میں یہ ہوگا کہ "تاکہ تم پر واضح ہوجائے کہ ہم پہلے ہی سے جانتے تھے کہ کون رسول کے اتباع میں ثابت قدم رہے گا اور کون الٹے پاؤں لوٹ جائے گا"۔ یہ بھی دور از کار تاویل ہے

Marfat.com

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اگرچہ اللہ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ کون سچا مؤمن ہے اور کون نہیں ہے، لیکن آیت میں ارشاد فرمایا کہ "تاکہ ہم جان لیں"۔ یہ طریقہ خطاب محض رفق و نرمی اور بندوں کو طاعت و عبادت کی طرف رغبت دلانے کے لیے اختیار کیا۔ جیسا کہ ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ "اِنَّا اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی ھُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" (ہم یا تم ہی ضرور راہِ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں)۔ یہ مخفی نہیں کہ آں حضورؐ ہدایت پر ہیں اور کفار گمراہی پر۔ لیکن خطاب میں نرم اور ٹھنڈا انداز اختیار کیا گیا اور صاف صاف یہ نہیں کہا گیا کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی پر۔ یہی حال آیت زیرِ تفسیر کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تاکہ تم لوگ جان لو کیوں کہ تم واقف نہیں ہو" لیکن بظاہر نسبت اپنی طرف کی اور فرمایا، "تاکہ ہم جان لیں"۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے ہی واضح کر دیا کہ ان تمام اقوال میں صحیح پہلا ہی قول ہے۔

"مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ" سے وہ حضرات مراد ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ کے احکام میں اتباع کریں۔ پس جس طرف آں حضورؐ اپنا چہرہ کریں وہ بھی اسی طرف کر لیں۔ "مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ" یعنی ان سے جو اپنے دین سے پھر کر منافق یا کافر بن جائے اور آں حضورؐ کی مخالفت کرنے لگے، تو ان سے وہ لوگ ممتاز ہو جائیں جو آں حضورؐ کے اتباع میں ثابت قدم اور مخلص ہیں۔ "الٹے پاؤں واپس ہونے" کا مفہوم یہ ہے کہ جس راستے سے ہو کر آیا تھا اسی راستے سے الٹے پاؤں اپنی سابقہ جگہ پر واپس چلا گیا۔ پھر ہر اس شخص پر اس کا اطلاق ہونے لگا جو کسی بھی معاملہ میں خواہ دین ہو یا کوئی بھلائی اختیار کرنے کے بعد اسے چھوڑ دے اور دوبارہ اپنے سابقہ دین اور طریقہ کو اختیار کر لے، یعنی جہاں سے آیا تھا پھر وہیں لوٹ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ذکر ہے کہ "فَارْتَدَّا عَلٰی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا" (پھر دونوں اپنے قدموں کے نشان پر الٹے چلے)۔ یہاں بھی وہی مفہوم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے رفیقِ سفر اسی راستے سے الٹے پاؤں واپس آ گئے جس سے خضر علیہ السلام کو تلاش کرتے ہوئے وہ آگے گئے تھے۔

"وَاِنْ کَانَتْ لَکَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰهُ" (اور یہ بہت گراں ہے، مگر ان لوگوں کو نہیں جنھیں اللہ نے راہ دکھا دی ہے) اس سلسلے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں کہ آیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ ایک قول یہ ہے کہ مراد تحویل و تولیہ ہے یعنی بیت المقدس کے بجائے خانۂ کعبہ کو قبلہ بنانا گراں ہے، "کَبِیْرَةً" مؤنث استعمال ہوا، کیوں کہ "تولیہ" (تحویل) بھی مؤنث ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ سے منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مراد قبلہ ہے، یعنی وہ قبلہ جس کی طرف آپ خانۂ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے نماز میں چہرہ کیا کرتے تھے (کچھ) لوگوں پر گراں تھا، سوا ان کے جنھیں اللہ نے راہ دکھا دی ہے۔ یہ قول ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مراد وہ نماز (صلاۃ) ہے جسے لوگ پہلے قبلہ (بیت المقدس) کی طرف چہرہ کر کے پڑھتے تھے۔ یہ تفسیر ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تمہاری اپنی نماز تم پر بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے پڑھنا گراں تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں قبلہ کی طرف رہنمائی کی۔ پہلا قول میرے نزدیک سب سے بہتر ہے، یعنی آیت سے مراد تحویلِ قبلہ لیا جائے، کہ ہم نے قبلہ جو بدل دیا ہے تو یہ حکم بہت گراں ہے، مگر ان لوگوں کو نہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے کیوں کہ مخالفوں نے اسی تحویلِ قبلہ ہی کے حکم پر اعتراضات کیے تھے اور یہی حکم لوگوں کے لیے گراں بنا تھا۔ "کَبِیْرَةً" یعنی "عَظِیْمَةً" (گراں، بھاری) ہے۔ ابن زید سے یہی معنی نقل ہے۔ "اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰهُ" یعنی ہمارا قبلہ کی تبدیلی کا حکم اگرچہ بہت گراں ہے، لیکن ان لوگوں پر نہیں جنھیں اللہ نے توفیق دی ہے اور آں حضورؐ اور آپؐ کی

Marfat.com

شریعت پر ایمان و تصدیق اور آپ کی اتباع کی ہدایت دی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر روایت ہے۔ "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ" "اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے (ایمان کو ضائع ہو جانے دے) کہا گیا ہے کہ آیت میں "ایمان" سے مراد نماز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی طرف چہرہ کرکے نماز پڑھنے لگے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمارے جو بھائی (مسلمان) اس سے پہلے انتقال کر گئے اور انھوں نے صرف بیت المقدس کی طرف رخ کرکے "نماز" پڑھی ان کا کیا ہوگا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ "اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع ہو جانے دے)۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ مراد "بیت المقدس کی طرف چہرہ کرکے تمہاری نماز ہے" قتادہ، سدی، ربیع، داؤد بن ابی عاصم سے بھی اوپر کی روایت کی طرح منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں بصراحت "إِيمَانَكُمْ" سے مراد تمہاری وہ نمازیں جنھیں تم نے خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے پڑھیں"، منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تحویل قبلہ کے حکم کے بعد مؤمنین کے دلوں میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں ان کی وہ نمازیں ہی نہ قبول ہوئی ہوں جو انھوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے پڑھیں۔ ابن زید اور سعید بن مسیب رحمہا اللہ سے بھی "ایمانکم" سے مراد "صلاتکم" منقول ہے۔ ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں کہ "ایمان" نام ہے تصدیق کا۔ تصدیق کبھی تنہا زبان سے ہوتی ہے، کبھی تنہا عمل سے ہوتی ہے اور کبھی دونوں سے ہوتی ہے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اور اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ تم نے اپنی ان نمازوں کے ذریعہ جنھیں بیت المقدس کی طرف چہرہ کرکے پڑھا تھا اور اس طرح اس کے رسول کی تصدیق کی تھی، اسے ضائع ہو جانے دے۔ کیونکہ تمہارا یہ عمل بھی میری طاعت اور میرے حکم کے مطابق میرے رسول کی تصدیق کی غرض سے صادر ہوا تھا۔ "ضائع ہو جانے دینے" کا مفہوم یہ ہے کہ ان پر ثواب نہ دے، اور اس طرح انھیں اکارت ہو جانے دے، جیسے آدمی اپنے مال کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے، یعنی ایسے مواقع میں خرچ کرتا ہے جن کا نہ کوئی دنیاوی فائدہ ہو اور نہ دینی۔ تحویل قبلہ کے بعد چوں کہ زندہ مؤمنین کو بھی یہ الجھن ہو گئی تھی کہ ان کی نمازیں کہیں بے کار اور ضائع نہ ہو گئی ہوں، اس لیے "ایمانکم" "(تمہارے ایمان) فرمایا، کہ اس میں مردے اور زندے سب آجاتے ہیں۔ اہل عرب اگر مخاطب اور غائب دونوں کے لیے ایک صیغہ یا ضمیر استعمال کرنا چاہتے تو مخاطب ہی کی استعمال کرتے تھے۔

"إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ" (اور اللہ تو لوگوں پر بڑا شفیق ہے، بڑا مہربان ہے) یعنی اپنے تمام ہی بندوں پر بڑا شفیق ہے۔ "رَأْفَة" (جس سے "رَءُوفٌ" نکلا ہے) میں رحمت کے اعلیٰ معانی پائے جاتے ہیں، یہ لفظ عام اور بہت وسیع ہے اور دنیا میں تمام مخلوق کے لیے اور آخرت میں بعض کے لیے رحمت و شفقت کے مفہوم کا حامل ہے لیکن "رَحِيم" کے مفہوم میں رحمت کی خصوصیت صرف مؤمنین کے ساتھ ہے، دنیا اور آخرت میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر غایت درجہ رحیم و شفیق ہے، کبھی ایسا ممکن نہیں کہ وہ اپنے فرمانبردار بندوں کی طاعت و عبادت کو ضائع ہو جانے دے، یا جو حکم اب تک فرض نہیں ہوا تھا اس پر کوئی مواخذہ کرے۔ یعنی اے مسلمانو! اپنے ان بھائیوں کا غم نہ کھاؤ جو خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے انتقال کر گئے اور انھوں نے صرف بیت المقدس کی طرف چہرہ کرکے نماز پڑھی، کیونکہ وہ بھی انھوں نے میری طاعت و عبادت ہی کے لیے کیا تھا اور میں اس پر انھیں پوری پوری جزا دوں گا، میں ان کے حق میں بڑا شفیق، بڑا رحم والا ہوں۔

Marfat.com

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا

ہم آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں اس لیے ہم (وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم آپ کو اُسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دینگے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ

جس کے لیے آپ کی مرضی ہے (تو) پھر (حکم بھی دیئے دیتے ہیں کہ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کیطرف کیا کیجئے اور تم سب لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو اپنے چہرہ کو

شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا

اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو اور یہ اہل کتاب بھی یقیناً جانتے ہیں کہ یہ (حکم) بالکل ٹھیک ہے (اور) ان کے پروردگار ہی کی طرف سے (ہے) اور

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہیں اور اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں پیش کر دیں

بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ

جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے (پھر موافقت کی کیا صورت) اور ان کا

بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ

کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا۔ اور اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو اختیار کرلیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس

مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

علم (وحی) آئے پیچھے تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں

آں حضورؐ کا انتظار و اشتیاق

”قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ (یقیناً ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا آسمان کی طرف بار بار اٹھنا، پس ہم ضرور آپ کو متوجہ کر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں، سو اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف)۔ خطاب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ ہم نے آپ کے منہ کا آسمان کی طرف بار بار اٹھنا دیکھ لیا۔ ”تَقَلُّبَ“ بمعنی اٹھنا، پھرنا۔ ”فِي السَّمَآءِ“ یعنی آسمان کی طرف، اس کی سمت۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے، یہ آیت اس لیے نازل ہوئی کہ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے حکم سے پہلے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظر بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے، آپؐ کو کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کا انتظار تھا۔

چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تحویل قبلہ سے پہلے آں حضورؐ نظر مبارک بار بار آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھتے تھے، آپ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ قبلہ بجائے بیت المقدس کے خانہ کعبہ کو بنا دے، آخر اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا۔ ربیع اور سدی رحمہما اللہ سے بھی یہ روایت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آں حضور خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے حکم کو کیوں پسند

Marfat.com

کرتے تھے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تو یہود نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ دیکھتے نہیں، ہمارے ہی قبلہ کی طرف چہرہ بھی کرتے ہیں اور ہمارے دین کی مخالفت سے بھی باز نہیں آتے، اس لیے آں حضورؐ نے بیت المقدس کے قبلہ باقی رہنے کو ناپسند کیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب یہودیوں نے اس طرح کے اعتراضات کیے تو آں حضورؐ قبلہ کی تبدیلی کی دعا کرتے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "اینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ" (سو جدھر کو بھی منہ پھیرو اللہ ہی کی ذات ہے)۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قوم یہود اللہ کے گھروں میں سے ایک گھر بیت المقدس کو قبلہ بنائے ہوئے ہے، ہم بھی کیوں نہ اسی کو اپنا قبلہ بنائیں۔ چنانچہ آں حضورؐ نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف چہرہ کرکے نماز پڑھی۔ اس کے بعد آپؐ کو معلوم ہوا کہ یہودی کہتے ہیں کہ بجز، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان کا قبلہ کدھر ہے اور ہم نے ان کی رہ نمائی کی، تو آں حضورؐ نے اس کے بعد بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھنا پسند نہیں کیا اور آپ آسمان کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر دعا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ یہی آپ کے جدامجد ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ تھا۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔ "فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا" یعنی پس ہم ضرور آپ کو پھیر دیں گے بیت المقدس سے اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں اور جس سے آپ محبت رکھتے ہیں "فَوَلِّ وَجْهَكَ" یعنی پس آپ پھیر لیجیے اپنا چہرہ "شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" (مسجد حرام کی طرف) میں "شطر" کا معنی ہے "طرف، سمت" ابن عباس اور براء بن عازب رضی اللہ عنہما اور ابوالعالیہ، مجاہد، قتادہ، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے "شطر" کا یہی مفہوم نقل ہوا ہے۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ بیت المقدس کے بجائے جب خانہ کعبہ قبلہ ہوا تو آں حضورؐ کو خانہ کعبہ کی کس مخصوص جگہ کی طرف نماز میں چہرہ کرنے کا حکم ہوا تھا؟ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مراد حیال میزاب الکعبہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خانہ کعبہ تمام کا تمام ہی قبلہ ہے اور خانہ کعبہ کا قبلہ اس کا دروازہ ہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد صرف یہ ہے کہ "سو آپ کر لیجیے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف"، اس لیے مسجد حرام کی طرف اور اس کی سمت میں چہرہ کرکے جو بھی نماز پڑھے گا وہ قبلہ کی طرف چہرہ کرنے والا سمجھا جائے گا، نیت ہونی چاہیے کہ قبلہ کی طرف چہرہ کر رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص امام کی اقتدا میں نماز پڑھتا ہے تو اس کے لیے صرف امام کی اقتدا ضروری ہے، یہ ضروری نہیں کہ پیچھے بالکل امام کے محاذ میں کھڑا ہو۔ امام کے پیچھے صف کے سب سے آخری اور بعید گوشے میں بھی کھڑا ہونے والا امام کی اقتدا کرنے والا سمجھا جائے گا، صرف اتنا کافی ہے کہ پیچھے کھڑے ہو کر اس طرف چہرہ کرکے نماز پڑھے جس طرف اس کے امام کا چہرہ ہو۔ یہی صورت حال قبلہ میں بھی ہے۔ قبلہ کے بالکل محاذ میں کھڑا ہونا ضروری نہیں، اور نہ ہر نمازی کے لیے ممکن ہی ہے، صرف سمت کافی ہے، خواہ کعبہ اس سمت میں کھڑے ہونے والے کے دائیں طرف پڑتا ہو یا بائیں طرف، وہ کعبہ ہی کی طرف چہرہ کرنے والا سمجھا جائے گا، ضروری یہ ہے کہ کھڑے ہونے والے کا چہرہ سمت قبلہ سے منحرف نہ ہونا چاہیے۔ علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل ہے۔ اور خود بیت اللہ کا قبلہ اس کا دروازہ ہے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ سے نکلے اور اس کی طرف چہرہ کرکے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا کہ یہی قبلہ ہے۔

Marfat.com

"وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ" (اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے کرلیا کرو اسی کی طرف) یعنی اے مسلمانو! تم روئے زمین کے کسی بھی حصہ میں ہو، اپنی نمازوں میں مسجد حرام ہی کی طرف چہرہ کرلیا کرو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ کہیں بھی ہوں نماز پڑھنے کے لیے خانہ کعبہ کی طرف اپنے چہرے پھیر لیا کریں۔ "وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ" (اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی ہے وہ یقیناً جانتے ہیں کہ وہ حکم واقعی ان کے پروردگار کی طرف سے ہے)۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ کے علماء ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صرف یہود مراد لیے گئے ہیں کہ وہ اس حکم کو اللہ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں۔ یہ قول سدی سے منقول ہے

"لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ" یعنی اہل کتاب کے یہ علماء و احبار خوب جانتے ہیں کہ مسجد حرام کا قبلہ بنایا جانا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اسے ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بنایا تھا اور آپؑ کی نسل اور آپ کے بعد تمام اللہ کے بندوں کا یہی قبلہ ہے۔ "مِنْ رَبِّهِمْ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں پر اسے فرض اور ضروری قرار دیا ہے۔

"وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ" (اور اے مومنو! جو کچھ تم کررہے ہو اس سے اللہ غافل نہیں، وہ تمھیں اپنے حکم کی اتباع کرتے ہوئے اور اپنی طاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے کہ تمھیں جب تک بیت المقدس کی طرف نماز میں چہرہ کرنے کا حکم تھا تم نے ویسا ہی کیا اور پھر جب قبلہ بدل دیا گیا تو اللہ کے اس حکم کو بھی تم نے بے چون وچرا تسلیم کرلیا، وہ کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے، ہر عمل اس کے یہاں محفوظ ہے اور وہ تمھیں سب کا بہترین بدلہ دے گا۔

ضد اور عناد کا کوئی علاج نہیں

"وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ" (اور اگر آپ ان لوگوں کے سامنے جنھیں کتاب مل چکی ہے ساری ہی نشانیاں لے آئیں پھر بھی یہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں) یعنی اے محمدؐ! آپ ان یہود و نصاریٰ کے سامنے خواہ کیسی ہی دلیل لاکر رکھدیں اور ثابت کردیں کہ حق وہی ہے جس کا آپ کو قبلہ کے سلسلے میں حکم دیا گیا ہے، بہرحال یہ اس کی تصدیق نہیں کرسکتے، اور تمام دلائل وشواہد کے باوجود اتباع سے گریز ہی کریں گے

"وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ" یعنی اے محمدؐ! آپ کے لیے ان کے قبلہ کی پیروی کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں، کیونکہ یہودی تو اپنی نمازوں میں بیت المقدس کی طرف چہرہ کرتے ہیں اور نصاریٰ مشرق کی طرف۔ پس جب کہ ان کے قبلہ کی پیروی بیک وقت آپ کے لیے ممکن بھی نہیں، اس لیے بس آپ اپنے اسی قبلہ کی پیروی کیجیے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور یہود و نصاریٰ جو طنز و تعریض کررہے ہیں اس کی طرف توجہ بھی نہ کیجیے۔

"وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ" یعنی نہ یہود نصاریٰ کے قبلہ کی پیروی کرسکتے اور نہ نصاریٰ یہود کی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح روایت ہے۔ آپ نے بیان کیا کہ جب یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمدؐ تو اب اپنے آباء و اجداد کے شہر کے مشتاق ہوگئے ہیں، اگر وہ ہمارے قبلہ پر ثابت قدم رہ جاتے تو ہم بھی مان لیتے کہ وہی ہمارے وہ صاحب ہیں جن کی بعثت کا ہمیں انتظار تھا۔ اس پر ان الذین اوتوا الکتاب سے لیکتمون الحق وھم یعلمون تک آیتیں نازل ہوئیں۔ ہم نے جو تفسیر بیان کی اسی کے مطابق ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی بھی روایت ہے۔

Marfat.com

ابن جریر

"وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ" (اور اگر کہیں آپ بھی ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے تو یقیناً آپ بھی ظالموں میں ہوں گے) یعنی یہ یہود و نصاریٰ جو آپؐ سے اور آپؐ کے صحابہؓ سے یہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے، اے محمد! اگر آپ بھی انھیں خوش کرنے کے لیے کہیں ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں اور دوبارہ ان کے قبلہ کو اختیار کر لیں۔ "مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ" یعنی اس کے بعد کہ میری طرف سے اطلاع کے بعد آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ لوگ باطل پر محض عناد اور دشمنی میں جمے ہوئے ہیں، ورنہ حق ان پر بھی واضح ہے کہ جس قبلہ کو آپ نے اب اختیار کیا ہے یہی ابراہیم علیہ السلام اور آپؐ کے بعد آپ کی نسل کے تمام انبیاء کا قبلہ تھا۔ "إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ" یعنی اگر آپ نے ایسا کر لیا تو آپ بھی میرے ان بندوں میں سے ہو جائیں گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور میرے حکم و طاعت کو چھوڑتے ہیں۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ و انجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں اور

فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ

بعضے ان میں سے امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفاء کرتے ہیں۔ (حالانکہ) یہ امر واقعی منجانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝

سو ہرگز شک و شبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا

شبہ تک نہیں

"الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ" یعنی یہود و نصاریٰ کے احبار اور علماء خوب پہچانتے ہیں کہ خانہ کعبہ ان کا بھی قبلہ ہے، ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ ہے اور آپ سے پہلے تمام انبیاء کا قبلہ ہے، بالکل اس طرح جیسے وہ اپنی نسل والوں کو پہچانتے ہیں۔ قتادہ، ربیع، سدی، ابن زید اور ابن جریج رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی نسل والوں کو پہچانتے ہیں۔

"وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (اور بے شک ان میں کے کچھ لوگ خوب چھپاتے ہیں حق کو، حالانکہ جانتے ہوتے ہیں) مراد اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہی ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔

(لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ" میں حق سے مراد یہی قبلہ ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں چہرہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ ارشاد ہے کہ آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں، جو آپ سے پہلے تمام انبیاء کا قبلہ تھا، لیکن یہود و نصاریٰ نے اللہ کے حکم کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے مطابق اس میں تبدیلی کر لی اور بعض نے جانب مشرق کو اپنا قبلہ بنا لیا اور بعض نے بیت المقدس کو۔ اس کے علاوہ انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق معلومات کو بھی چھپایا، حالانکہ توریت و انجیل میں آپ کے متعلق لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آں حضورؐ اور آپ کی امت کو ان کی خیانت پر مطلع کرتا ہے اور

Marfat.com

اعلان کرتا ہے کہ جان بوجھ کر یہ لوگ حق کو چھپاتے ہیں اور قصداً اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ توریت وانجیل میں، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہوا پاتے ہیں اور اس کے باوجود آپ کے بارے میں حق کو چھپاتے ہیں۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد قبلہ ہے۔

"اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ" ارشاد ہے کہ جان لو، اے محمد! حق وہی ہے جو آپ کے رب نے آپ کو بتایا ہے اور اپنے پاس سے آپ تک بھیجا ہے، حق وہ نہیں ہے جو یہود و نصاریٰ کہتے ہیں۔ آیت میں آں حضور ؐ کو خبر دی گئی ہے کہ جس قبلہ کی طرف اب آپ کو پھیر دیا گیا ہے یہی اللہ کے خلیل ابراہیم اور آپ کے بعد تمام انبیاء کا قبلہ تھا، اس لیے آپ اس حق پر عمل کریں اور شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جائیں۔ ربیع ؒ سے یہی روایت ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ "فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ" یعنی اس بارے میں شک کرنے والوں میں ہرگز آپ نہ ہو جائیں۔ "اَلْمُمْتَرِیْ" مِرْيَةٌ بمعنی شک سے مُفْتَعِلٌ کے وزن پر ہے۔ ظاہر ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا، اس لیے آیت کے ظاہری الفاظ میں اگرچہ خطاب براہِ راست آپ کو ہے، لیکن مراد عام مؤمنین ہیں۔ ہم نے اس سے پہلے بہت سی مثالیں اس کی بیان کی ہیں کہ اہلِ عرب امر و نہی میں بعض اوقات کسی مناسبت کی وجہ سے براہِ راست خطاب کسی خاص فرد سے کرتے ہیں حالانکہ مراد دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ

اور ہر (مذہب والے) شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے سو تم نیک کاموں میں تگاپو کرو تم خواہ کہیں

بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

ہوگے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو حاضر کر دیں گے بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ

باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کی طرف رکھا کیجیے اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق ہے (اور) منجانب اللہ (ہے)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ

اور اللہ تعالیٰ تمہارے کیے ہوئے کاموں سے اصلاً بے خبر نہیں اور (مکرر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں اپنا چہرہ

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ

مسجد حرام کی طرف رکھیے اور تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ اسی کی طرف رکھا کرو

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ق

تاکہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں گفتگو کی مجال نہ رہے (ہاں) مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں

Marfat.com

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

تو ایسے لوگوں سے (اصلا) اندیشہ نہ کرو اور مجھ سے ڈرتے رہو اور تاکہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام ہے اُس کی تکمیل کر دوں اور تاکہ (دنیا میں) تم راہِ راست (حق) پر رہو

ہر قوم راست رہا ہے!

"وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا" (اور ہر ایک کے لیے کوئی رخ ہوتا ہے جدھر وہ متوجہ رہتا ہے) یعنی ہر قوم و ملت کے لیے۔ یہاں "ملت" کا لفظوں میں ذکر نہیں کیونکہ عبارت سے خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کا ایک قبلہ ہے، نصاریٰ کا ایک قبلہ ہے اور اسی طرح تمہارا بھی ایک قبلہ ہے۔ مجاہد، عطاء، ابن جریج، ابن زید، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے۔ لیکن قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دوسری روایت بھی ہے کہ مراد بیت المقدس کی طرف اور پھر اس کے بعد کعبہ کی طرف چہرہ کرکے نماز پڑھنا ہے۔ اس تفسیر کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے محمدؐ! آپ کو اللہ جس طرف بھی نماز میں پھیر دے وہی اللہ کا قبلہ ہے کہ جدھر وہ اپنے تمام بندوں کو پھیرنا چاہتا ہے۔ "وِجْهَةٌ" "تَوَجُّهٌ" سے مصدر ہے۔ مراد وہ سمت ہے جس کی طرف آدمی اپنی نماز میں رُخ کرتا ہے۔ مجاہد، ابن زید اور منصور رحمہم اللہ سے "وجهة" قبلہ کے معنی میں نقل ہوا ہے، اور ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے "رخ" کے معنی ہیں۔ "هُوَ مُوَلِّيهَا" یعنی وہ اپنا چہرہ اس (قبلہ) کی طرف کرتا ہے اور اس کا استقبال کرتا ہے۔ یہ معنی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے "تولیۃ" (جس سے "مُوَلِّيْ" نکلا ہے) آیت میں توجہ و اقبال کے معنی میں ہے جیسے اِنْصَرَفَ اِلَيَّ (اِلیٰ کے صلہ کے ساتھ) کے معنی ہیں کہ میری طرف متوجہ ہوا، ورنہ "اِنْصِرَاف" کا اصل مفہوم "کسی چیز سے پھرنا ہے"، لیکن جب (بصلہ اِلیٰ) "اِنْصَرَفَ اِلَى الشَّيْءِ" بولتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں "اس چیز کی طرف متوجہ ہوا" یعنی اس کے غیر سے پھر کر۔ یہی حال آیت میں استعمال ہونے والے لفظ "تولیۃ" کا ہے۔ اگر "وَلَّيْتُ عَنْهُ" استعمال ہوگا (عن کے صلہ کے ساتھ) تو معنی ہوں گے کہ "میں نے اس سے پیٹھ پھیر لی" لیکن "وَلَّيْتُ اِلَيْهِ" کے معنی ہیں "میں اس کی طرف متوجہ ہوا" یعنی اس کے غیر سے پیٹھ پھیر کر۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر اہل ملت کا ایک قبلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنا چہرہ اپنے اسی قبلہ کی طرف پھیرتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک قراءت "هُوَ مُوَلَّاهَا" نقل ہوئی ہے۔ یعنی (ہر ایک کے لیے ایک قبلہ ہوتا ہے کہ) جدھر اسے پھیرا جاتا ہے۔ اس قراءت میں فاعل یعنی پھیرنے والے کا ذکر نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ ہر اہل ملت کا ایک قبلہ ہوتا ہے جدھر اللہ اسے پھیرتا ہے۔ میرے نزدیک پہلی قراءت درست ہے، کیونکہ اس پر تقریباً اجماع ہے، اس کے خلاف جو قراءت ہے وہ نقل و روایت کی حیثیت سے شاذ ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" (پس تم نیکیوں کی طرف بڑھو) "فَاسْتَبِقُوا" یعنی بڑھو، جلدی کرو۔ اس کا مصدر "اِسْتِبَاق" ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے مومنو! میں نے حق تمہارے سامنے واضح کر دیا ہے اور تمہاری اس قبلہ کی طرف رہنمائی کر دی ہے جس کے بارے میں یہود، نصاریٰ اور تمام ملت والے گمراہ ہو گئے تھے پس اب تم اعمالِ صالحہ کو اپنے رب کے یہاں ذخیرہ کرنے کے لیے آگے بڑھو اور اپنی اس دنیا میں آخرت کے لیے زادِ راہ تیار کر لو، میں نے نجات کا راستہ تمہارے لیے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، اپنے قبلہ کی حفاظت کرو اور پچھلی امتوں کی طرح اسے ضائع نہ کر دو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے "اَلْخَيْرَاتِ" سے مراد اعمالِ صالحہ منقول ہے۔

Marfat.com

"اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" یعنی تم جس جگہ جس خطہ زمین میں بھی مروگے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم سب کو لائے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ربیع اور سدّی رحمہما اللہ سے یہی منقول ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اپنی طاعت اور آخرت کے لیے تیاری کی ترغیب دی ہے کہ اے مومنو! نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کی طرف بڑھو اور تمہاری اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ اور ان کے طریقہ کی طرف جو رہنمائی کی ہے اس پر ہمیشہ قائم رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمھیں اور انھیں بھی جو اللہ کے دین اور اس کی شریعت کے مخالف ہیں سب کو جمع کرے گا اور اس دن سب کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا، اللہ تعالیٰ تمہاری مختلف مقامات میں موت کے بعد تمھیں پھر زندہ کر کے ایک جگہ جمع کرنے پر اور تمھیں جزا و سزا دینے پر قادر ہے، اس لیے حشر کے دن سے پہلے اعمالِ صالحہ کی طرف بڑھو اور کچھ ذخیرہ آخرت کرتے جاؤ۔

"وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ" یعنی "اور آپ جس جگہ بھی نکلیں اور جہاں بھی متوجہ ہوں تو اے محمدؐ! اپنا چہرہ مسجدِ حرام کی طرف موڑ لیا کریں، اور بے شک مسجدِ حرام کی طرف منہ موڑنا آپ کے رب کی طرف سے امرِ حق ہے"، یعنی اس کی حفاظت کرو اور قبلہ کے بارے میں اللہ کے حکم کی اطاعت کو لازم جانو" اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو"، یعنی تمہارے تمام اعمال اس کے یہاں محفوظ ہیں اور وہ ان کا بدلہ تمھیں قیامت میں دے گا۔

"وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ" یعنی اے محمدؐ، آپ جس جگہ بھی قیام کریں اور پھر وہاں سے باہر نکلیں تو اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف موڑ لیا کریں، اور اے مومنو! تم لوگ بھی جہاں کہیں ہو، اپنی نمازوں میں، اپنا منہ اسی کی طرف موڑ لیا کرو"

۱۳۳۹۸

"لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ" "تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں حجت نہ رہ جائے، سوا ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں، سو تم ان سے نہ ڈرو، بلکہ صرف مجھی سے ڈرتے رہو" مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت میں "اَلنَّاس" "(لوگوں)" سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ چنانچہ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو قبلہ بنایا تو اہلِ کتاب نے کہا کہ اب یہ صاحب اپنے جدِ امجد (ابراہیم علیہ السلام) کے گھر اور اپنی قوم کے دین کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ "حجت" جس کا ذکر آیت میں ہوا ہے، "تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں "حجت" نہ رہ جائے" تو مفسرین نے اس سے اشارہ یہودیوں کے اس قول کی طرف لیا ہے جو وہ آں حضورؐ کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر کہا کرتے تھے، کہتے کہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے قبلہ ہی کا پتہ نہیں تھا، یہ روشنی انھیں ہمیں سے ملی ہے، کبھی کہتے کہ محمدؐ دین کے معاملہ میں تو مخالفت پر تلے ہوئے ہیں لیکن قبلہ کے معاملہ میں ہماری ہی اتباع کرتے ہیں۔ عرب کے جاہل اور مشرک لوگ بھی اس میں خوب دلچسپی لیتے تھے۔ یہی وہ حجت تھی جسے اہلِ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں استعمال کرتے تھے اور جو تحویلِ قبلہ کے بعد..... باقی نہیں رہی۔ "اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ" سے مراد قریش کے مشرک افراد ہیں۔ مجاہد، سدّی، ربیع، قتادہ اور عطاء رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ بعض روایتوں میں عام مشرکینِ عرب کا ذکر ہے۔ "حجت" کا مفہوم خصومت اور جدال ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "تاکہ کسی بھی شخص کو تمہارے خلاف خصومت اور باطل دعوے کی گنجائش باقی نہ رہ جائے"، البتہ عرب کے مشرکین قریش اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ انھیں تمہارے

Marfat.com

خلاف بلا وجہ اور بلا کسی حق کے یہ باطل دعویٰ ہے کہ اب جبکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے تو کچھ دنوں میں ہمارے دین کی طرف بھی لوٹ آئیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کا سرے سے ہی استثناء کر دیا کہ یہ لوگ بلا وجہ کی بکواس کر رہے ہیں۔ جو تفسیر آیت کی ہم نے بیان کی وہی مجاہد، قتادہ، ربیع اور سدی رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت المقدس سے کعبہ مکرمہ کی طرف پھیر دیا گیا تو مکہ کے مشرک کہنے لگے کہ محمد کچھ گھبرائے ہوئے پریشان سے ہیں، ابھی تو صرف قبلہ تمہاری طرف پھرا ہے، اور یہی اس کی دلیل ہے کہ تمہی حق پر ہو، لیکن بہت جلد دین بھی وہ تمہارا ہی اختیار کر لیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ عطاء اور مجاہد رحمہا اللہ سے اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے۔ آیت میں استثناء کی صورت اس جملہ جیسی ہے "مَا ذَهَبَ مِنَ النَّاسِ أَحَدٌ إِلَّا أَخُوكَ" (سوا تمہارے بھائی کے کوئی بھی نہیں گیا) یعنی تمام دوسرے لوگوں سے تو جانے کی نفی ہے لیکن "بھائی" اس سے استثناء کر لیا گیا ہے۔ یہی صورت آیت میں ہے کہ "تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں حجت نہ رہ جائے، سوا ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں" یعنی دوسرے لوگوں سے تو خصومت و جدل کی نفی کر دی ہے کہ اب کعبہ کو قبلہ بنانے کے بعد ان کی حجت ختم ہو جائے گی، لیکن اس حکم نفی سے قریش کے ظالم لوگوں کا استثناء کر دیا، کیونکہ انھوں نے اب ایک باطل دعویٰ کھڑا کر دیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اب ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے، اور جلد ہی ہمارے دین کی طرف بھی لوٹ آئیں گے۔ جب مفسرین کے اجماع سے یہ تفسیر ثابت ہوتی ہے جو ہم نے بیان کی تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں "إِلَّا" یعنی واو ہے وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آیت کا مفہوم یہ بتاتے ہیں کہ "جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے لیے کوئی حجت نہیں ہے، اس لیے آپ ان سے کوئی خطرہ نہ کھائیے" وہ بھی غلطی پر ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ "جن لوگوں نے ظلم کیا" سے مراد اہل عرب کے بعض وہ افراد ہیں جو یہودی یا نصرانی تھے، کیونکہ وہی لوگ آں حضور کے مقابلہ میں حجت کیا کرتے تھے، تمام اہل عرب ایسا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح کے بعض اور اقوال بھی ہیں، جو غلط اور اجماع مفسرین کے خلاف ہیں۔ آیت میں "إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا" سے قریش ہی مراد ہیں جن کے لیے جدل و خصومت کا نیا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بحث کرنے لگا کہ موسیٰ علیہ السلام تو صخرہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اس پر ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ صخرہ کے پاس کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ یہودی نے کہا کہ پھر ہمارے اور آپ کے درمیان صالح علیہ السلام کی مسجد سے فیصلہ ہوگا، آپ نے اسے پہاڑ کھود کر تعمیر کیا تھا۔ ابوالعالیہ نے فرمایا کہ میں نے اس میں نماز پڑھی ہے اور اس کا قبلہ خانہ کعبہ ہی کی طرف ہے۔ ربیع نے بیان کیا کہ مجھے ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی کہ انھوں نے مسجد ذوالقرنین بھی دیکھی تھی اور اس کا بھی قبلہ کعبہ کی طرف تھا۔

"فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي" یعنی آپ ان لوگوں سے نہ ڈریئے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے اور آپ سے حجت اور جدال کرتے ہیں، بلکہ مجھ سے ڈریئے، اور میری سزا سے خوف کھائیے کہ اگر تم میں سے کسی نے بھی میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو وہ سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اس جملہ میں مومنین کو خانہ کعبہ کی طرف نماز میں رخ کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کے بجائے کسی اور طرف رخ کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ یہ خطرہ تم نہ کھاؤ کہ پھر میں تمھیں مشرکین کے دین کی طرف پھیروں گا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ "وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ" یعنی تاکہ اس طرح میں تمہاری اپنے خلیل کے قبلہ کی طرف ہدایت کر کے، کہ جنھیں میں نے لوگوں کے لیے امام بنایا تھا، تم پر اپنا انعام پورا کروں

Marfat.com

اور ...... ملت حنیفیہ مسلمہ کی شرائع کی تکمیل کردوں، یہی وہ ملت تھی جس کی اللہ تعالیٰ نے نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور تمام دوسرے انبیاء کو وصیت کی تھی اور یہی وہ نعمت ہے جس کی تکمیل آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ پر ہونے والی تھی۔ "لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" یعنی تاکہ تم صحیح قبلہ کی طرف ہدایت پا جاؤ۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا (جو کہ) تم ہی میں سے (ہیں اور وہ) ہماری آیات (و احکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (جہالت)

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ۛ

تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ع

ان (نعمتوں) پر مجھ کو یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گذاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو

حضور اکرمؐ کی بعثت اور اس کا مقصد

"كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ"

یعنی جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا تاکہ ملت حنفیہ کی شرائع کو بیان کرے ہم تم پر اپنی نعمتوں کو پوری کر دیں اور اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے دین کی طرف تمہاری ہدایت کر دیں، وہ دعا جو انھوں نے کی تھی اور ہم سے مانگا تھا کہ "اے رب! ہمیں اپنا حکمبردار رکھیے اور ہماری نسل سے بھی ایک امت پیدا کیجیے جو آپ کی حکم برداری کرے اور ہمیں ہمارے مناسک دکھا دیجیے اور ہماری توبہ قبول کیجیے، بے شک آپ بڑے ہی توبہ قبول کرنے والے رحم کرنے والے ہیں" اسی طرح ہم نے ان کی اس دعا کو بھی قبول کیا کہ "ان میں ایک رسول انھیں میں سے بھیجیے، جو ان پر آپ کی آیات کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، یقیناً آپ بڑے غالب بڑے حکمت والے ہیں" چنانچہ اپنے خلیل ابراہیم اور ان کے صاحبزادے اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کے نتیجہ میں ہم نے اپنا ایک رسول تمہاری طرف بھیجا ہے۔ یہ آیت "وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ" کے صلہ کے طور پر ہے، "فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ" سے متعلق نہیں ہے جو اس کے بعد آ رہا ہے، کیونکہ عربوں کے استعمال سے مطابقت نہیں کھاتا۔ لیکن ابو نجیح اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ آیت زیر تفسیر کا تعلق آگے کی آیت "فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ" ہی سے جوڑتے ہیں اور اسے اس کا جواب قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تصریح کی گئی، یہ ترکیب کلام عرب کے خلاف ہے "كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا" کا مفہوم یہ ہے کہ اے عرب، میری طاعت کو لازم پکڑ لو اور اس قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو جس کا میں نے تمھیں حکم دیا ہے، تاکہ یہود کی حجت باقی نہ رہے، اور تاکہ میں اپنا انعام تم پر پورا کروں اور تم ہدایت پا جاؤ، جیسا کہ میں نے تمہاری طرف ...... تمہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ "رسول" جو عربوں کی طرف بھیجے گئے تھے، سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ "يَتْلُوْا اٰيٰتِنَا" میں آیات سے مراد قرآن ہے "وَيُزَكِّيْكُمْ" یعنی تمھیں گناہوں کے میل سے پاک کرتا ہے۔ "وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ" میں کتاب سے مراد فرقان ہے، یعنی وہ تمھیں کتاب الٰہی کے احکام کی تعلیم دیتا ہے

Marfat.com

"حکمۃ" سے مراد سنت اور دین کی سمجھ ہے ان تمام امور کی تفصیل ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ "وَیُعَلِّمُکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" یعنی تمھیں انبیاء کے حالات، گذشتہ امتوں کے واقعات اور بہت سے وہ امور جو آئندہ پیش ہونے والے ہیں اور جن کا عربوں کو کوئی علم نہیں، سب کی تمھیں تعلیم دیتے ہیں، اس لیے آں حضورؐ سے تم ان تمام امور کا علم حاصل کرو۔
"فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ" یعنی اے مومنو! مجھے تم یاد کرتے رہو، ان تمام معاملات میں اپنی طاعت کے ذریعہ جن کا میں نے تمھیں حکم دیا ہے یا جن سے روکا ہے تو میں بھی تمھیں اپنی رحمت و مغفرت کے ذریعہ یاد کرتا رہوں گا۔ یہ تفسیر سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ لیکن ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ "ذکر" سے مراد شاد ہے، آپ نے فرمایا کہ جو اللہ کو یاد کرتا ہے اللہ بھی اسے یاد کرتا ہے، جو شکر کرتا ہے اس کے لیے مزید اضافہ کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے اسے عذاب دیتا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے
"وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ" یعنی اے مسلمانو! ایمان اور اس راستے کی طرف جس کی میں نے تمھیں ہدایت دی ہے اور جو انبیاء واصفیاء کا راستہ تھا، اس کے لیے تم شکر ادا کرو، اور میرے احسان کا کفر نہ کرو کہ تم پر جو انعامات ہیں وہ بھی چھن جائیں۔ شکر کرو گے تو اور پاؤ گے۔ ہم اس سے پہلے لکھ آئے ہیں کہ "شکر" کا مفہوم ہے کسی آدمی کی اس کے اچھے اور پسندیدہ عمل پر تعریف، اور "کفر" نام ہے کسی چیز کو چھپا دینے کا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

اے ایمان والو (غم ہلکا کرنے کے لیے) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے

الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ

والوں کے ساتھ رہتے ہیں (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ) اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی

اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ

طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم (ان) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔ اور (دیکھو) ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف

وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ

اور فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے۔ اور آپ ایسے صابرین کو بشارت

الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ

سنا دیجیے (جن کی یہ عادت ہے) کہ اُن پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (دل سے) یوں کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد حقیقۃً) اللہ

وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں اُن لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی اُن کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی

Marfat.com

وَرَحْمَةٌ قف وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○

اور (سب پر بالاشتراک) عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقتِ حال تک) رسائی ہو گئی

صبر و نماز کی تلقین

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو طاعت و بندگی اور جسمانی و مالی مصائب اور پریشانیوں کے لیے ابھارا ہے، ارشاد ہے، اے مسلمانو! میری طاعت اور میرے احکام و فرائض کی ادائیگی میں اور اگر اس سلسلہ میں تمھیں اسلام کے دشمنوں سے دل خراش جملے سننے پڑتے ہیں یا تمھیں اور کوئی جسمانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو ان تمام معاملات میں صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو، تم نے اگر ناپسندیدہ و ناگوار امور پر صبر کیا تو تمھیں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی اور نماز سے تمہاری مشکلات کی گرہیں کھلیں گی، کیونکہ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو میرے فرائض کی ادائیگی میں، اور گناہوں کو چھوڑنے میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ آیت کی تفسیر میں ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ صبر و نماز سے مدد چاہو کہ یہ اللہ کی طاعت ہیں اور اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ۔ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" یعنی اللہ اس کا مددگار اور پشتبان ہے اور اس کے کام سے راضی اور خوش ہے

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" یعنی اے مومنو، صبر اور نماز سے مدد چاہو، "اور جو اللہ کے راستے میں قتل ہو جائیں انھیں مردہ نہ کہو"، کیونکہ مُردہ (میّت) وہ کہلاتا ہے جس کی زندگی سلب کی جائے اور اس کے حواس باقی نہ رہیں، نہ کسی چیز کے مزے کا احساس اسے ہو اور نہ نعمتوں کا، لیکن تم میں سے جو لوگ میرے راستے میں قتل ہوئے ہیں وہ میرے یہاں زندہ ہیں اور ان کی زندگی نہایت عمدہ اور قابلِ رشک ہے، میں نے ان کے لیے اپنے فضل سے ہر طرح کی نعمتیں مہیا کی ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شہداء اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، اور اگرچہ وہ جنت میں نہیں رکھے جاتے، لیکن جنت کے پھلوں سے انھیں روزی دی جاتی ہے اور اس کی خوشبو ان کے پاس آتی رہتی ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، شہیدوں کی ارواح سفید پرندوں میں رکھی جاتی ہیں، جنت کے پھلوں کی انھیں روزی ملتی ہے اور ان کا مسکن سدرۃ المنتہیٰ پر ہوتا ہے، مجاہد کی تین خصوصیات ہیں، اگر وہ اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاتا ہے تو زندہ رہتا ہے اور اسے روزی دی جاتی ہے، اگر غالب آتا ہے تو اللہ اسے بہت بڑا اجر دیتا ہے اور اگر وفات پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ عمدہ روزی سے اسے نوازتا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ شہداء سبز پرندوں کی صورت میں جہاں چاہیں گے جنت میں اڑتے رہیں گے اور جہاں سے چاہیں گے کھائیں پئیں گے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔

جہاں تک اس دنیاوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد برزخی[1] زندگی کا تعلق ہے تو وہ عام مومنین بلکہ کفار کو بھی حاصل ہوتی ہے

---

[1] دُنیاوی زندگی کے ختم ہونے اور اخروی زندگی کے شروع ہونے کے درمیانی عرصہ میں مُردہ کی روح جہاں رکھی جاتی ہے اس کا نام ہے "برزخ"۔ برزخ ہماری اس دنیا سے قطعاً مختلف اور اس دنیا میں جب تک ہم ہیں ہمارے لیے ایک غیر مرئی چیز ہے۔ یہ آخرت کی زندگی کا ایک دروازہ ہے اور دنیا کے اعمال کا بدلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے قیامت کے بعد آخرت کی زندگی شروع ہوگی۔ "برزخ لغتِ عرب (باقی بر ص ۲۷)

Marfat.com

ابن جریر
آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ اس مضمون کی احادیث ثابت ہیں کہ مرنے کے بعد مومن بندوں کے لیے جنت کے دروازے ان کی قبروں کی طرف کھول دیے جاتے ہیں، وہ جنت کی شمیم سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ قیامت جلدی آجائے، تاکہ وہ اپنے مسکن میں جلدی پہنچ جائیں اور وہاں اپنے اعزہ واقارب اور متعلقین کے ساتھ ملیں لیکن کفار کا حال اس سے مختلف ہوتا ہے، ان کی قبروں کی طرف جہنم کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، وہ اس کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کی بدبو اور مکروہات سے ان کا بُرا حال رہتا ہے، اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ قیامت دیر میں آئے۔ شہدا کو بھی برزخی زندگی ہی حاصل ہوتی ہے، لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں برزخ میں جنت کی روزی بھی ملتی ہے، وہ صرف اس کی ہواؤں کا ہی لطف نہیں اٹھاتے بلکہ وہ تمام لذتیں اور راحتیں انھیں ملتی ہیں جو صرف اہل جنت کا حصہ ہیں اور قیامت سے پہلے شہیدوں کے سوا اور کسی کو نہیں ملتیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا کہ انھیں مردہ نہ خیال کرو، وہ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس سے روزی دیے جاتے ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شہدا جنت کے دروازے پر ایک نہر کے کنارے سبز گنبد میں رہتے ہیں اور جنت سے ان کے لیے صبح وشام روزی آتی ہے۔ آیت سے مقصود صرف ان کی زندگی کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ مقصد ان کی ان نعمتوں کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے جو برزخ میں صرف انھیں کو حاصل ہوتی ہیں۔ آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہدا کو مردہ کہنے سے لوگوں کو منع کیا ہے۔ "وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" یعنی تم کوئی انھیں دیکھتے نہیں کہ تمھیں ان کی زندگی کا حال معلوم ہو سکے، اس کا علم تو صرف میرے بتانے کے بعد ہی ممکن ہے۔

آزمائش ہوگی

"وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ" (اور ہم تمہاری آزمائش کرکے رہیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال اور جان اور پھلوں کے کچھ نقصان سے اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کو اطلاع دی ہے کہ انھیں مصائب ومشکلات کے ذریعہ آزمایا جائے گا اور یہ بات کھول دی جائے گی کہ کون اپنی اتباع میں ثابت قدم اور مخلص ہے اور کون غیر مخلص اور پیچھے لوٹ جانے والا ہے۔ اس سے پہلے قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ بنا کر مسلمانوں کو آزمایا گیا تھا اور اس سے بھی پہلے پچھلی امتوں کے پاکباز لوگوں کو آزمایا جا چکا تھا۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ "کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ دراں حالے کہ ابھی تم پر ان لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، انھیں تنگی اور سختی پیش آئی، اور انھیں ہلا ڈالا گیا، یہاں تک کہ پیمبر اور جو لوگ ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی امداد آخر کب آئے گی، سن رکھو کہ اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے"۔ یہی تفسیر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ دنیا امتحان اور آزمائش کی جگہ ہے، مسلمانوں کو بھی یہاں آزمایا جائے گا۔ پھر انھیں صبر کی تلقین کی اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنائی۔ پھر ارشاد ہے کہ یہاں اس سے پہلے بھی ہمیشہ انبیا اور اولیا کو آزمایا جاتا رہا ہے۔ "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ" یعنی ہم تمہاری آزمائش کریں گے۔ ابتلا کا مفہوم ہم اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر آئے ہیں۔ "بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ" سے مراد دشمن کا خوف ہے "اَلْجُوْعِ" یعنی

(بقیہ صفحہ ۲۶) میں دو چیزوں کے درمیان کی روک، یا دو چیزوں کی درمیانی حالت کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

Marfat.com

قحط مطلب یہ ہے کہ ہم تمھیں دشمن کے خوف اور قحط سالی کے ذریعہ آزمائیں گے، کچھ تمہارے دشمنوں سے تمہاری لڑائیاں ہوں گی، قحط پڑے گا اور اس طرح تمہارے مال اور تمہاری تعداد میں کمی ہوگی، اس کے علاوہ تمہاری اولاد، اہل خاندان کی موت کا بھی صدمہ اٹھانا پڑے گا، قحط سالی کے نتیجہ میں پھلوں کی کمی ہوگی۔ یہ سب کچھ ہوگا اور تمہاری آزمائش کے لیے ہوگا پھر معلوم ہو جائے گا کہ کون ایمان میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے، جو لوگ تمہارے یہاں صاحب بصیرت ہیں انھیں منافقوں کا بھی اسی میں پتہ چل جائے گا۔ آیت میں خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کو ہے، جیساکہ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آزمائش ہو چکی ہے اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔ آگے کی آیات میں اسی لیے ارشاد ہے کہ ”اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں“

”وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ یعنی جو لوگ میرے امتحان پر پورے اترے ہیں، جن اعمال سے میں نے منع کر دیا ہے، مشکل حالات میں بھی اس کی طرف نہیں بڑھتے اور جن امور کا میری طرف سے حکم ہے، کسی آزمائش میں بھی اسے ہاتھ سے جانے دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، بلکہ ایسے اوقات میں ان کی زبانوں پر ہوتا ہے کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف واپس لوٹنا ہے ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ایسے لوگوں کو میری طرف سے خاص طور سے بشارت سنا دیجیے، ان کی یہ استقامت رائگاں نہیں جائے گی، کہ انھوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی میری ربوبیت، وحدانیت، آخرت کی تصدیق اور میری ہی طرف واپس لوٹنے کی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، سارا فیصلہ انھوں نے مجھی پر چھوڑا ہے، میرے ثواب کی امید اور میرے عقاب سے خوف رکھتے ہیں۔

”أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ“ مراد وہی صابرین ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا، ارشاد ہے کہ ان پر اللہ کی مغفرت ہوگی، اللہ کی اپنے بندوں پر ”صلواۃ“ کا مطلب ”اللہ کی اپنے بندوں کے لیے مغفرت“ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَىٰ آلِ أَبِي أَوْفَىٰ“ کا بھی مفہوم یہی ہے کہ ”اے اللہ، آلِ ابی اوفیٰ کی مغفرت کر دے“۔ ”وَرَحْمَةٌ“ یعنی اللہ کی مغفرت اور گناہوں کی معافی کے علاوہ اس کی ”رحمت“ اور نوازشات بھی ان پر ہوں گی۔ اس ذکر کے بعد کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت ان پر ہے، ارشاد ہے کہ ”وہی راہ یاب ہیں“۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ مؤمن جب معاملہ اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور مصیبت کے وقت ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ (بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں) پڑھتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کے حق میں تین بھلائیاں لکھی جاتی ہیں اللہ کی طرف سے مغفرت، اس کی رحمت اور راہ یابی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مصیبت کے وقت انا للہ الخ پڑھنے والے کی مصیبت اللہ تعالیٰ جوڑ دیتا ہے، اس کی آخرت سدھار دیتا ہے اور اولادِ صالح عطا فرماتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس امت مسلمہ کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ کسی امت کو نہیں ملا، پھر آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی کہ مصیبت کے وقت جو لوگ ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھتے ہیں انھیں اللہ کی مغفرت اور رحمت ملتی ہے، اگر کسی اور کو یہ دولت ملتی تو یعقوب علیہ السلام کو ضرور ملتی، لیکن آپؑ کی زبان سے کبھی مصیبت کے وقت یہ الفاظ نکلے ”يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ“۔

Marfat.com

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ

تحقیقاً صفا و مروہ یادگار (دین) خداوندی ہیں سو جو شخص حج کرے بیت (اللہ) کا یا (اس کا) عمرہ کرے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا

اُس پر ذرا بھی گناہ نہیں (ہوتا) ان دونوں کے درمیان آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے) اور جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے

فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۝

حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدر دانی کرتے ہیں (اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص) خوب جانتے ہیں۔

اللہ کے شعائر

"إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ"، "الصَّفَا" صَفَاةٌ کی جمع ہے، چکنے پتھر کی چٹان کو کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ "صفا" واحد ہے، اس کا تثنیہ (دو کے لیے) "صَفْوَان" اور جمع (تین یا اس سے زیادہ) اَصْفَاء، صَفِيَّاء وغیرہ ہے۔ "مَرْوَة" چھوٹی کنکریوں کو کہتے ہیں، جمع قلت (تین سے نو تک کے لیے) "مَرَوَات" اور جمع کثرت "مَرْوٌ" استعمال ہوتی ہے، جیسے تَمْرَةٌ، تَمَرَاتٌ اور تَمْرٌ علی الترتیب استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں "صَفَا" اور "مَرْوَة" سے دو پہاڑ مراد ہیں جو ان ناموں کے حدودِ حرم میں موجود ہیں۔ "مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ" یعنی دونوں پہاڑیاں اللہ کی طرف سے علامتیں ہیں جو اس نے اپنے ذکر کے لیے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں، بندے وہاں پہنچ کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، دعا کے ذریعہ، ذکر کے ذریعہ یا ان اُمور کی انجام دہی کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے وہاں پر فرض کیے ہیں۔

آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے شعائر کے بارے میں فرمایا کہ وہ خبر ہیں جو میں تمھیں بتاؤں گا۔ اصل میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ "شَعَائِر"، شَعِيرَة کی جمع ہے اور "اِشْعَار" سے نکلا ہے یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کو صفا اور مروہ اور اس سے متعلق طواف وغیرہ کی خبر دیتا ہے۔ یہ تفسیر بڑی دور از کار ہے، اللہ تعالیٰ نے تو یہاں یہ بتانا چاہا ہے کہ صفا اور مروہ اللہ کی طرف سے دو علامتیں ہیں جو اس نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس وقت بتائی تھیں جب انھوں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ مجھے مناسکِ حج دکھا دے۔ آیت کے الفاظ اگرچہ خبر کے ہیں، لیکن مراد حکم ہے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت کی اتباع کا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بعد میں آنے والے تمام لوگوں کے لیے امام بنا کر بھیجا تھا۔

"فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ"[1]، حَجَّ الْبَيْتَ یعنی قصد کر کے جو بیت اللہ آئے، ہر وہ شخص جو کسی چیز کے پاس بار بار جاتا ہو، اس چیز کی طرف نسبت کر کے اسے "حاج" کہیں گے۔ حج کرنے والے کو بھی "حاج" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بیت اللہ عرفات کے میدان میں ٹھہرنے سے پہلے آتا ہے، پھر دوبارہ وقوفِ عرفات کے بعد قربانی کے دن طواف کے لیے حاضری دیتا ہے، اس کے بعد منیٰ چلا جاتا ہے اور پھر طوافِ صدر کے لیے حاضر ہوتا ہے۔ اس طرح چونکہ اسے بار بار بیت اللہ آنا پڑتا ہے اسی لیے اسے "حاج" کہتے ہیں۔ عمرہ کرنے والے کو "معتمر" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کے طواف اور اس کی زیارت کے بعد واپس آجاتا ہے۔ آیت میں "أَوِ اعْتَمَرَ الْبَيْتَ" کے معنی ہیں یا بیت اللہ کا عمرہ

(۱۔ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Marfat.com

کرے۔ "اعتمار" کے اصل معنی زیارت کے ہیں "اعتمر" یعنی بیت اللہ کا قصد وارادہ کیا۔

"فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" "تو اس پر ذرا بھی گناہ نہیں اگر وہ ان دونوں کے درمیان آمد ورفت کرے"۔ آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام سے پہلے ان دونوں پہاڑیوں، صفا اور مروہ پر دو بت رکھے ہوئے تھے اور زمانہ جاہلیت میں مشرکین ان دونوں بتوں کی تعظیم میں دو پہاڑیوں کے درمیان آمد ورفت کرتے تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ قضا کیا تو آپؐ کے بہت سے صحابہؓ جنھوں نے جاہلیت میں ان بتوں کی تعظیم کے لیے ان دونوں پہاڑیوں کا طواف کیا تھا، گھبرائے اور کہنے لگے کہ اللہ کے سوا کسی بھی چیز کی عبادت تو شرک ہے، ان پہاڑیوں کے درمیان ہم کیسے آمد ورفت کرلیں؟ جاہلیت کے زمانہ میں ان کے درمیان آمد ورفت بتوں کی تعظیم کے لیے کی جاتی تھی، لیکن اب تو اسلام آچکا ہے، ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی تعظیم وعبادت کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ "صفا اور مروہ تو اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں" مراد ان کے درمیان آمد ورفت سے ہے، چوں کہ یہ معلوم تھا، اس لیے الفاظ میں اس کا ذکر نہیں کیا، اس لیے جو لوگ اب اسلام کے بعد ان کے درمیان آمد ورفت کریں انھیں جاہلیت کے ان بتوں کے خیال سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ لوگ تو اللہ کے کفر اور شرک کے جذبہ سے ان کا طواف کرتے تھے اور تم ایمان وتصدیق کے جذبہ سے ان کے درمیان آمد ورفت کروگے، اس لیے ان کے درمیان آمد ورفت کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں "جُنَاحَ" بمعنی اثم، گناہ ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں، بلکہ اس کے درمیان سعی میں تمہارے لیے اجر وثواب ہے۔ ہم نے آیت کی جو تفسیر بیان کی وہ صحابہؓ وتابعینؒ سے بتواتر ثابت ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ جاہلیت میں ایک بت صفا پر تھا اور اس کا نام "اساف" تھا اور ایک بت مروہ پر تھا، اس کا نام "نائلہ" تھا، مشرکین بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد ان دونوں بتوں پر بھی ہاتھ پھیرنے آتے تھے جب اسلام کو غلبہ ہوا اور یہ بت توڑ دیئے گئے تو صحابہؓ کو ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان آمد ورفت کرنے میں تامل ہوا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے بھی اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے۔

ایک دوسرا قول آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ ایسے لوگ تھے جو صفا اور مروہ کے درمیان آمد ورفت کرتے نہیں جاتے تھے، جب اسلام آیا تو جاہلیت کے پرانے تخیل کے مطابق ان کی سعی کرنے میں انھیں خوف محسوس ہوا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تہامہ کا ایک قبیلہ زمانہ جاہلیت میں صفا اور مروہ کی سعی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ؎ "حج" عبادات اسلامی کا چوتھا رکن ہے۔ اُمت کے ہر فرد پر خواہ کسی جگہ کا رہنے والا ہو، بشرط صحت واستطاعت وامن راہ عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ حج میں تین چیزیں فرض ہیں (۱) حدود حرم میں داخلہ سے پہلے احرام کا لباس یعنی خاص شرائط کے ساتھ بے سِلا ہوا لباس پہننا (۲) ۹ ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں حاضری، اصطلاح میں اسے وقوف عرفہ کہتے ہیں (۳) طواف زیارت یعنی وقوف عرفہ کے بعد خانہ کعبہ کا طواف۔ عمرہ، اس کا دوسرا نام حج اصغر ہے۔ اس میں حج کی طرح مہینہ اور تاریخ کی قید نہیں اور نہ اس میں وقوف عرفات ہے۔ عمرہ کی نیت سے احرام حدود حرم سے باہر باندھنا چاہیئے، پھر طواف کعبہ اور اس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان آمد ورفت یعنی سعی کرے۔ عمرہ پورا ہوگیا، اب وہ احرام کھول سکتا ہے۔

Marfat.com

نہیں کرتا تھا، اسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا کہ صفا اور مروہ بھی اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں اور ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنا ابراہیم اور اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔

عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے آیت کے متعلق عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت کرنے (سعی) میں کوئی گناہ نہیں یعنی اگر سعی نہ کی جائے جب بھی کوئی حرج نہیں ہوگا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم نے آیت کا غلط مطلب نکالا، آیت اصل میں انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اسلام سے پہلے وہ اپنے بت "مناۃ" کے لیے، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان راستے میں رکھا ہوا تھا، احرام باندھتے تھے اور ان کے بہت سے افراد صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں حرج محسوس کرتے تھے، اسلام کے بعد جب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ "صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت کرنے (سعی) میں کوئی حرج نہیں" عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت کی سنت قائم کی ہے، اس لیے کسی کے لیے اس کا ترک جائز نہیں۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے اہل علم کے حوالہ سے بیان کیا کہ جب بیت اللہ کے طواف کے لیے بصراحت آیت نازل ہوئی اور صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا تو بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تامل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سعی کا تو کوئی ذکر کیا نہیں، سعی کرنی بھی چاہیئے یا نہیں؟ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے حضرات نے سوال کیا کہ ایسی صورت میں کیا ہمارے لیے کوئی حرج ہے کہ ہم صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت (سعی) نہ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بہرحال آیت کے نازل ہونے کی مذکورہ دونوں وجہیں ہو سکتی ہیں۔

صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت (سعی) کے سلسلے میں کئی مسلک ہیں۔ ایک مسلک کے مطابق ان کے درمیان سعی واجب ہے، اس کے بجائے فدیہ سے اس کی کفایت نہیں ہوتی، بلکہ اگر کوئی شخص اسے چھوڑے گا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دوبارہ اعادہ کرے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما سے یہی روایت ہے۔ دوسرا قول امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو چھوڑ دینے والا شخص اگر دوبارہ سعی کر لیتا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اس پر اس کے بدلہ میں ایک قربانی واجب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ سعی صرف نفل ہے اور چھوڑنے کی صورت میں کوئی قربانی یا فدیہ واجب نہیں۔ یہ حضرات آیت کو "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا" پڑھتے ہیں۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول روایت ہے۔ آپ مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے استدلال کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی اس قول کی تائید میں ہے۔ عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نفل ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ صفا اور مروہ کی سعی فرض واجب ہے اور جو شخص اسے چھوڑے گا اس کی قضا اس پر واجب ہوگی، خواہ قصداً چھوڑے یا بھول کر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل روایات اس کی تائید میں موجود ہیں۔

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقعہ پر صفا پہاڑی کے قریب پہنچے تو مذکورہ آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ تم بھی اپنے عمل کی وہیں سے ابتدا کرو جس کے ذکر سے اللہ نے ابتدا کی ہے، چنانچہ آپ نے صفا سے سعی کی ابتدا کی اور اس پر چڑھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ بیت اللہ کے طواف کا جس طرح کوئی فدیہ نہیں، اور چھوڑنے والے کے لیے اس کی قضا ضروری ہے، یہی صورت صفا اور مروہ کی سعی میں بھی ہوگی

Marfat.com

دونوں طواف ہی کہلائیں گے، ایک میں بیت اللہ کا طواف ہے، دوسرے میں صفا اور مروہ کا، جو لوگ ان دونوں میں فرق کرتے ہیں انھیں اس کی وجہ بتانی ہوگی۔ تیسرے قول کی تائید میں جو قراءت "لایطوف" کی ذکر کی گئی ہے وہ تمام مشہور ومتواتر مصاحف کے خلاف ہے اور اسے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

"وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ" (اور جو کوئی خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو اللہ بڑا قدردان ہے، بڑا علم رکھنے والا ہے) یعنی اپنے اوپر فرض حج کی ادائیگی کے بعد جو کوئی اپنی خوشی سے حج یا عمرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کے قدردان ہیں اور انھیں نیتوں کا بھی خوب علم ہے، وہ اس کا بدلہ ضرور دیں گے۔ بعض لوگ آیت سے یہ معنیٰ نکالتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی نفل ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی روایت ہے۔ اس قول کی بنیاد پر مطلب یہ ہوگا کہ "جس نے صفا اور مروہ کے درمیان آمد ورفت اپنی خوشی سے کی، تو اللہ اس کی اس نیکی کا بڑا قدردان ہے، بڑا علم والا ہے"، لیکن ابن زید رحمۃ اللہ علیہ اس سے عمرہ مراد لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حج تو فریضہ ہے، لیکن عمرہ کسی پر بھی واجب یا فرض نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ

جو لوگ اخفا کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کو) ہادی ہیں بعد اسکے کہ

مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ

ہم ان کو کتاب (الٰہی توراۃ وانجیل) میں عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہیں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور (دوسرے بہتیرے) لعنت کرنیوالے

اللّٰعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوبُ

بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں مگر جو لوگ توبہ کرلیں اور اصلاح کردیں اور (ان مضامین کو) ظاہر کردیں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ

عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

ہو جاتا ہوں اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا اور مہربانی فرمانا

حق چھپانے والوں کا حشر

"إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى" آیت سے مراد علماء یہود ونصاریٰ ہیں، جنھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں حق کو چھپایا اور آپ کی اتباع نہیں کی، حالاں کہ ان کی کتابوں توراۃ وانجیل میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق واضح طور پر لکھا ہوا موجود تھا، آپ کی نبوت کی تصدیق اور آپ کی اتباع کے حکم کے ساتھ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنو سلمہ کے معاذ بن جبل، بنو عبدالاشہل کے سعد بن معاذ اور بنو الحارث بن خزرج کے خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم نے چند علماء یہود سے توراۃ کے بعض مضامین کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتانے سے انکار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مجاہد، ربیع قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہم سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے کہ آیت علماء اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی، جن کی کتاب توراۃ وانجیل میں آں حضور کی تصدیق موجود تھی، لیکن پھر بھی وہ انکار کرتے تھے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت

Marfat.com

میں ہے کہ ایک یہودی ایک انصاری صحابی رض کا دوست تھا۔ انھوں نے جب یہودی سے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ کیا تمہارے یہاں آپ کے متعلق کچھ لکھا ہوا ہے تو اس نے انکار کیا، اس پر آیت نازل ہوئی۔ "مِنۡ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ" (بعد اس کے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے کتابِ الٰہی میں کھول چکے ہیں)۔ "لِلنَّاسِ" سے مراد "بَعۡضُ النَّاسِ" (بعض لوگ) ہیں، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، آپ کی بعثت اور آپ کی صفات کا علم اہل کتاب کے سوا اور کسی کو نہیں تھا، آیت میں "لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ" سے مراد بھی اہل کتاب اور ان کی کتابیں تورات وانجیل ہی ہیں۔ آیت اگرچہ مخصوص لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے حکم میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جو ایسی بات کو چھپاتے ہوں جس کا لوگوں کے سامنے بیان ان پر فرض ہو۔ اس مضمون کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، آپ نے فرمایا کہ جس شخص سے کسی ایسے علم کے متعلق پوچھا گیا جسے وہ جانتا تھا اور اس کے باوجود اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن آگ کی لگام اس کے منہ میں لگائی جائے گی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر قرآن مجید میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں تم سے کوئی حدیث نہ بیان کرتا، ایک یہی اور دوسری اسی مضمون کی آیت جو دوسرے موقعہ پر آئی ہے۔

"اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَیَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ" یعنی "یہی لوگ"، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حق اس کے باوجود چھپاتے ہیں کہ انھیں اس کے ظاہر کرنے کا حکم ہے، ان کے اس چھپانے کی وجہ سے "اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں"۔ "لَعۡنَۃ" "لَعَنَہُ اللّٰہُ" سے نکلا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے دور کردیا لعنت کا اصل مفہوم ہٹادینا، دور کردینا ہے۔ اس طرح آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کردیا ہے، اور لعنت کرنے والے بھی اپنے رب سے یہ دعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے اللہ، انھیں اپنی رحمت سے دور کر"۔ "لعنت کرنے والوں کی لعنت"، کا ہم نے جو یہ مفہوم بتایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں اپنی رحمت سے دور کر، تو اس کا ثبوت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ملتا ہے۔ آپ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب قحط پڑتا ہے تو چوپائے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ بنی آدم کے گنہگاروں کی وجہ سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ان پر"۔

اس میں اختلاف ہے کہ آیت میں "اللّٰعِنُوۡنَ" سے کون لوگ مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مراد زمین کے چوپائے، کیڑے مکوڑے اور بچھو وغیرہ ہیں، یہ کہتے ہیں کہ بنی آدم کے گناہوں کی وجہ سے ہم بوند کو ترس رہے ہیں۔ مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما سے یہی قول منقول ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ بہائم یا کسی بھی غیر بنی آدم کی جمع یا اور نون یا واؤ اور نون کے ساتھ نہیں آتی لیکن "لاعِنُوۡنَ" میں جمع واؤ اور نون کے ساتھ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد بہائم یا چوپائے وغیرہ نہیں ہیں۔ لیکن اہل عرب بہت سے مواقع پر، جبکہ انسانی صفات کی طرف اشارہ ہو رہا ہو، نہ صرف جمع میں، بلکہ عام خطاب میں وہ الفاظ اور صیغے استعمال کرتے ہیں جو صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً "وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِہِمۡ لِمَ شَہِدۡتُّمۡ عَلَیۡنَا" (اور وہ لوگ اپنی اپنی جلد سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے دی) "یٰۤاَیُّہَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ" (اے چونٹیو! اپنے سوراخوں میں جا گھسو)۔ یہی صورت "اللّٰعِنُوۡنَ" میں بھی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ملائکہ اور مؤمنین ہیں۔ قتادہ اور ربیع بن انس رحمہما اللہ سے اس کی روایت ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں کے سوا تمام مخلوق مراد ہے۔ سدّی رحمۃ اللہ علیہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ کافر کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو ایک جانور اس کے پاس آتا ہے، اس کی آنکھیں شعلہ برسا رہی ہوتی ہیں، اس کے ہاتھ میں لوہے کا

Marfat.com

ڈنڈا ہوتا ہے، اس سے وہ کافر کے دونوں مونڈھوں کے درمیان میں مارتا ہے، اس وقت مردہ کی جو چیخ نکلتی ہے اسے انسانوں اور جنوں کے سوا اللہ کی تمام مخلوق سنتی ہے، اور جو سنتا ہے اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ ضحاک سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے۔ ہمارے نزدیک ان تمام اقوال میں بہتر قول یہ ہے کہ "لاعنون" سے مراد ملائکہ اور مؤمنین ہیں۔ کفار کے ذکر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ "جو لوگ کفر کرتے ہیں اور پھر کفر ہی کی حالت میں مرجاتے ہیں تو ان پر اللہ کی، فرشتوں کی، اور تمام لوگوں کی لعنت ہوتی ہے" اس لیے زیر تفسیر آیت میں بھی "لعنت کرنے والوں" سے مراد انھیں ہی لیا جانا بہتر ہے۔

"اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ"، (البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور درست ہو جائیں اور ظاہر کردیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ میں ان پر متوجہ ہو جاؤں گا رحمت سے اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں، بڑا رحمت والا ہوں) یعنی اللہ اور لعنت کرنے والے ان لوگوں پر لعنت کرتے ہیں جو لوگوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپؐ کی دوسری صفات کے بارے میں حق کو چھپاتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں میں سے کوئی چھپانے سے باز آجائے اور توبہ کرکے آں حضورؐ پر ایمان لائے، آپ کی نبوت و شریعت کی تصدیق کرے اور اللہ کی رضا کے مطابق اچھے اعمال کرکے اپنا حال ٹھیک کرلے اور جو کچھ اسے اپنی آسمانی کتابوں کے ذریعہ آں حضورؐ کے متعلق معلوم ہے اسے سب کے سامنے بیان کردے اور کوئی بات چھپائے نہ رکھے، تو یقیناً میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کروں گا اور انھیں اہل ایمان اور اپنے طاعت گذار بندوں میں بنا دوں گا۔ پھر ارشاد ہے کہ "اور میں ہی ہوں جو اپنے بندوں کے اپنی طرف سے پھرے ہوئے دلوں کو دوبارہ اپنی طرف لوٹا لیتا ہوں، اور وہ میری محبت کے طالب ہو جاتے ہیں اور میں رحم کرنے والا ہوں، کہ جب وہ میری طرف واپس آتے ہیں تو انھیں معاف کر دیتا ہوں۔ اسی کے مطابق تفسیر قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے منقول ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ آیت میں "بَیَّنُوْا" (اور ظاہر کردیں) کا مطلب یہ ہے کہ اپنی توبہ کو مخلصانہ عمل کے ذریعہ ثابت کردیں۔ لیکن آیت سے جو مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے، یہ اس کے خلاف ہے۔ آیت میں ذکر اہل کتاب کے حق کو چھپانے کا چلا آرہا ہے، اور پھر انھیں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اگر وہ توبہ کرلیں اور حق کو ظاہر کردیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔ آیت میں اخلاص عمل کا ذکر نہیں کہ یہ مراد لیا جاسکے۔ اس آیت سے ..... عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے جیسے دوسرے اہل کتاب مراد ہیں جو اسلام لائے تھے اور آں حضورؐ کی مخلصانہ اتباع کی تھی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ

البتہ جو لوگ (اُن میں سے) اسلام نہ لادیں اور اسی حالت غیر اسلام پر مرجاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ

اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ اُسی (لعنت) میں رہیں گے۔ اُن سے عذاب ہلکا ہونے

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ

پادے گا۔ اور نہ (دخل ہونے کے قبل) انکو مہلت دیجاویگی اور (ایسا معبود) جو سب کے معبود بننے کا مستحق ہے وہ تو ایک ہی معبود حقیقی ہے اسکے سوا کوئی

Marfat.com

ابن جریر

الرَّحِیْمُ ۝ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ

عبادت کے لائق نہیں (وہی) رحمٰن اور رحیم ہے۔ بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے بنانے میں

وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ

اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) لے کر اور (بارش کے) پانی میں جس کو

السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے

مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ص وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین آسمان کے

بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے دلائل (توحید کے موجود) ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں

کفر پر مرنے والوں کا حشر

"اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ" یعنی جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے ہیں خواہ وہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ہوں، یا مشرکین اور دوسرے مذہب والے، اگر وہ اسی انکار کی حالت میں مر گئے تو یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے۔ اللہ نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا، دھتکار دیا، اور ان پر لعنت ہے فرشتوں کی اور آدمیوں، سب کی۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں "وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ" سے مراد تمام انسان نہیں ہیں، بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے مراد ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سب ہی لوگ مراد ہیں، قیامت کے دن کافر کو سب کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور سب اسے لعنت کریں گے۔ چنانچہ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ کافر کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کریں گے، پھر فرشتے لعنت کریں گے اور پھر سب لوگ لعنت کریں گے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ہر شخص ہی یہ کہتا ہے کہ "اللہ ظالم پر لعنت کرے"، اور اس طرح ہر شخص کی لعنت کافر تک پہنچتی ہے، کیونکہ وہ بھی ظالم، حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ یہ قول سدی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ میرے نزدیک ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے، یعنی یہ کہ تمام لوگ مراد ہیں۔ ہر بنی آدم ظالم پر لعنت بھیجتا ہے، اور قرآن مجید میں خود اس کا تذکرہ آیا ہے کہ قیامت کے دن کفار کو ان کے پروردگار کے حضور میں پیش کیا جائے گا اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کو جھٹلایا تھا، اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔[1]

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ عام ظالموں اور کافروں پر آیت میں لعنت کا تذکرہ ہے، اور وہ بھی موت کے بعد!۔ چنانچہ اہلِ سنت کے یہاں (باقی بر صفحہ

"خَالِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ"۔ "خَالِدِيْنَ" اس سے پہلے "عَلَيْهِمْ" کی ضمیر سے حال ہے "فِيْهَا" میں "هَا" کی ضمیر سے لعنت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر کو اللہ، فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کے نتیجہ میں جو جگہ ملے گی (اس میں اسے ہمیشہ رہنا ہوگا)۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل ہوئی ہے۔ "لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ" یعنی ان کا عذاب دوامی ہوگا اور اس میں کسی قسم کی تخفیف بھی نہ ہوگی۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت میں یوں ذکر ہوا ہے کہ "جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ انھیں موت آئے گی اور نہ ان پر سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔"

ایک موقعہ پر ارشاد ہے کہ "جب بھی ان کا چمڑا گل جایا کرے گا تو ہم اس کو دوسرے چمڑے سے بدل دیا کریں گے۔" "وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ" یعنی انھیں عذر معذرت کرنے کی مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔ ابو العالیہ رح سے یہ تفسیر نقل ہے۔

"وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" یعنی تمہارا معبود جس کی طاعت و عبادت تمہارے لیے ضروری ہے۔ وہ ایک ہی ہے، اس لیے اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک نہ کرو۔ کیا اتنی موٹی بات بھی تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم معبودِ واحد کے ساتھ جن چیزوں کو عبادت میں شریک کرتے ہو، وہ بھی تمہاری ہی طرح کی مخلوق ہیں، ان کی جیسی بہت سی دوسری چیزیں موجود ہیں، حالاں کہ معبود اور رب تو وہ ہے جس کا کوئی مثل و نظیر نہیں، وہ یکتا ہے اور ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت (وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ) کے مفہوم کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے مراد یہ ہے کہ اس جیسا، اس کا مثل کوئی نہیں۔ بولتے ہیں "فُلَانٌ وَاحِدُ النَّاسِ" یعنی فلاں کی مثال نہیں، اس جیسا کوئی لوگوں میں نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا مطلب یہ ہے کہ "اللہ تمام چیزوں میں منفرد اور یکتا ہے، کیونکہ اللہ کسی بھی دوسری چیز میں نہیں سما سکتا اور نہ کوئی دوسری چیز اس میں سما سکتی ہے، وہ منفرد ہے، یکتا ہے۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" یعنی دونوں جہان کا رب اس کے سوا اور کوئی نہیں، اور بندوں پر اس کے سوا کسی اور کی عبادت ضروری نہیں، بلکہ اس کے سوا تمام موجودات اسی کی مخلوق ہیں اور سب پر اس کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت ضروری ہے، یہ جو تم نے بہت سے دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تو انھیں کوئی قدرت نہیں، نہ نقصان پہنچانے کی اور نہ نفع پہنچانے کی۔

آیت میں اہلِ شرک کو تنبیہ ہے کہ گمراہی سے باز آجائیں اور اللہ کی طرف رجوع کریں جو تنہا، منفرد اور یکتا ہے۔ آگے کی آیات میں انھیں کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، ارشاد ہے کہ اے مشرکین، اگر تمھیں معلوم نہیں ہے، یا میں نے جو کچھ بتایا کہ تمہارا معبود صرف ایک ہے اس پر تمھیں یقین نہیں، تو پھر تم خود غور و فکر کرو، آسمان و زمین، دن اور رات کا اس تسلسل اور ترتیب کے ساتھ آنا جانا کہ اپنے مقررہ حدود سے سرِمو تجاوز نہیں کرتے، آسمان پر بادل اور ان کا پانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کسی متعین گنہگار پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ کسی کو متعین کیے بغیر مطلق صورت میں جائز ہے، مثلاً چور پر لعنت ہے وغیرہ۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ مومن پر لعنت اس کے قتل کے برابر ہے۔ آیت "وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ" سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں کسی کافر متعین پر بھی لعنت جائز نہیں ہے۔ "مَاتُوْا" کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ آیت ان کے لیے ہے جن کی موت ہی کفر پر ہو چکی ہو۔ کیونکہ موت سے پہلے کسی کو نہیں معلوم کہ کب وہ ایمان اور عملِ صالح اختیار کرلے۔

(مترجم)

Marfat.com

جو مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور تمام کائنات تمھیں دعوتِ فکر دیتی ہے، سوچو، کیا تمہارے یہ بُت اور معبود اس کے انتظام و انصرام پر قدرت رکھتے ہیں، کیا وہ ان جیسی کوئی بھی چیز پیدا کر سکتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر غیر اللہ کی عبادت کرنے کیلئے تمہارے لیئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

کائنات کی شہادت

آگے کی آیات "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ" سے آخر تک کے شانِ نزول کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ جب آیت "وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" نازل ہوئی اور آں حضور ﷺ نے اسے صحابہ رضؓ کو سنایا تو بہت سے مشرکین نے بھی سنا۔ مشرکین اس پہ کہنے لگے کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ معبود صرف ایک ہے، ہم تو اسے نہیں مانتے۔ ہمارے خیال میں تو بہت سارے معبود ہیں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، اور بتایا گیا کہ اللہ کی وحدانیت کی یہ دلیل ہے۔ عطاء سے روایت ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر "وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" مدینہ میں نازل ہوئی تو مکہ کے کفار قریش نے اس پر اعتراضات شروع کر دیئے کہ ایک معبود اتنے سارے انسانوں کے لیئے کیسے کافی ہو گا۔ ان کے جواب میں یہ آیات "لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ" تک نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور کائنات کی دوسری وہ تمام چیزیں جن کا ذکر آیت میں ہوا ہے، وہ ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کے لیئے اللہ کی وحدانیت پر واضح اور صاف نشانی ہیں۔ ابوالضحیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" جب نازل ہوئی تو مشرکین نے کہا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر کوئی معجزہ دکھایئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ عطاء بن ابی رباح سے بھی اس طرح کی ایک روایت ہے۔ سعید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قریش نے یہودیوں سے پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام کون سے معجزات لائے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ عصا کا اور ید بیضاء کا۔ پھر انھوں نے نصاریٰ سے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور برص کی بیماری والے کو اور اندھے کو اچھا کر دیا کرتے تھے۔ اب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ صفا پہاڑی ہمارے لیئے سونے کی ہو جائے، پھر ہم آپ پر یقین کر لیں گے۔ آں حضور ﷺ نے اللہ سے اس کے لیئے دعا کی۔ لیکن ادھر سے جواب آیا کہ ٹھیک ہے، ان کی خواہش کے مطابق میں صفا پہاڑی سونے کی بنائے دیتا ہوں، لیکن انھوں نے اگر اس کے باوجود انکار کیا تو ان پر ایسا عذاب نازل کروں گا جو ان سے پہلے کسی پر بھی نازل نہ کیا ہو گا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی کہ پھر مجھے حسبِ معمول اپنی قوم کو تبلیغ ہی کرنے دیجئے، میں انھیں ہر روز دعوت و تبلیغ کیا کروں گا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، اور انھیں بتایا گیا کہ اگر واقعی تمھیں یقین ہی مطلوب ہے تو یہ پوری کائنات اور اس کے تغیرات کی ترتیب و تنظیم یقین کے لیئے کافی ہے، کائنات اپنی عظمت اور پہنائی کے ساتھ، ایک چھوٹی سی پہاڑی، صفا، کو سونے کا بنا دینے سے کہیں بڑھ کر کارنامہ ہے اور اگر کوئی سچائی کے ساتھ حق کا طالب ہو تو اس کے یقین کے لیئے اس میں پورا پورا سامان موجود ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ آیت کے نازل ہونے کی جو دو وجہیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی ہو سکتی ہے بہر حال آیت کا مفہوم واضح اور صاف ہے۔

"وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ" یعنی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے اور اسے ایجاد کرنے میں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف "خَلْق" کی نسبت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ چیز پہلے سے موجود نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی نمونہ کے اسے پیدا

Marfat.com

کیا" وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ" اور رات اور دن کے پے در پے آنے جانے میں "اِخْتِلَاف" خُلُوْف سے نکلا ہے، یعنی دونوں میں ہر ایک معینہ ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کی جگہ لیتا ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر یہی مضمون بیان ہوا ہے "وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا" (اور وہ وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنا دیا اس شخص کے لیے جو سمجھنا چاہے یا شکر ادا کرنا چاہے)۔ مطلب وہی ہے کہ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں "لَیْلٌ" لَیْلَةٌ کی جمع ہے (بمعنی رات)، جیسے تَمْرٌ، تَمْرَةٌ (بمعنی کھجور) کی جمع استعمال ہوتی ہے۔ اس کی جمع "لَیَالِیْ" بھی آتی ہے۔ "نَهَارٌ" (دن) کی جمع اہل عرب استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ اسے "ضَوْء" (روشنی) کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ہاں "نُهُرٌ" اس کی جمع سنی گئی ہے۔ لیکن اگر جمع ہی لانی ہے تو پھر "اَنْهِرَةٌ" قیاس کے مطابق ہوگی۔

"وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ" یعنی اور جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں اور لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش ہیں "اَلْفُلْكُ" بمعنی کشتی، جہاز۔ واحد، جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

"وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" اور اس پانی میں جسے اللہ نے زمین سے اتارا" مراد بارش کا پانی ہے۔ "پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد جلا اٹھایا" مراد زمین کی زندگی اس پر نباتات اور سبزہ زار کا اُگنا اور اس کی تعمیر ہے۔ "بِهٖ" کی ضمیر سے مراد پانی ہے اور "بَعْدَ مَوْتِهَا" میں "هَا" کی ضمیر سے مراد "زمین" ہے۔ زمین کی موت اس کا اجاڑ اور سبزیوں اور نباتات کا ختم ہو جانا ہے، کہ اسی سے مخلوق روزی حاصل کرتی ہے۔

"وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ" اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیئے۔ بولتے ہیں "بَثَّ الْاَمِیْرُ سَرَایَاهُ" امیر نے اپنا لشکر پھیلا دیا۔ "هَا" کی ضمیر سے مراد زمین ہے۔ "دَآبَّةٌ" "دَبَّتِ الدَّابَّةُ" سے اسم فاعل ہے۔ "دَآبَّةٌ" ہر اس ذی روح کو کہتے ہیں جو اڑنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، بلکہ صرف زمین پر چل سکتا ہو (دَبَّ، بمعنی ہاتھوں یا پیروں کے بل چلنا یا رینگنا)۔ "وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ" اور ہواؤں کے بدلنے میں" مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہواؤں کے بدلنے میں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہی ہوا جو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے، جب وہ چاہتا ہے تو لوگوں کے لیے اسے عذاب بنا دیتا ہے اور لوگوں پر وہ اللہ کا قہر اور عذاب بن کر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کبھی تو ہوا رحمت بن کر آتی ہے اور کبھی یہی ہوا تباہی و بربادی لاتی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر و توانا ہے۔ بعض اہل عربیت نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ کبھی شمالی ہوا چلتی ہے، کبھی جنوبی، کبھی پچھوا ہوتی ہے اور کبھی پروا۔ اور یہی ہواؤں کا بدلنا ہے۔ "وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ" سَحَابٌ، سَحَابَةٌ کی جمع ہے، بمعنی بادل۔ بادل کو "سحاب" اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کا بعض حصہ دوسرے بعض کو کھینچتا ہوا چلتا ہے، بولتے ہیں "فُلَانٌ یَسْحَبُ ذَیْلَهٗ" یعنی فلاں اپنا دامن گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔ "لَاٰیٰتٍ" یعنی یہ علامتیں اور دلائل ہیں، اس کے کہ ان تمام چیزوں کا خالق اور انھیں عدم سے وجود بخشنے والا ایک ہے۔ "لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ" یعنی ان لوگوں کے لیے جو اتنی سمجھ اور عقل رکھتے ہیں کہ کوئی دلیل جب ان کے سامنے آئے تو اس کے مدلول کا وہ ادراک کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح کر دیا ہے کہ دلیل اور حجت صرف انھیں لوگوں کے لیے ہے

Marfat.com

جو عقل اور تمیز رکھتے ہیں، کہ یہی طبقہ امر و نہی اور طاعت و عبادت کا مکلف ہے، اور انھیں کو طاعت پر ثواب اور معصیت پر عقاب ہوگا جو لوگ سرے سے عقل و تمیز ہی نہیں رکھتے وہ احکام کے بھی مکلف نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ سب اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کا کوئی ایسا پیدا کرنے والا اور پھر انکا انتظام کرنے والا ضرور ہے جو اپنی کاریگری میں بے نظیر ہے۔ زمین و آسمان کی غیر محدود وسعتیں، پہاڑوں اور سمندروں کے طویل سلسلے، سمندروں میں کشتیوں کا آنا جانا، اور رات اور دن اور پورے نظام کے ساتھ ایک کے پیچھے دوسرے کا آنا اور جانا اللہ کی بے مثل اور بے نظیر ذات پر کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، کوئی نہیں جو ان چیزوں کی مثال پیدا کردے جو اللہ نے پیدا کی ہیں عام اہل عرب اللہ کی بالا اور برتر ذات کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ بہت سے معبودان باطل کو شریک کرتے تھے، اس لیے جب انھوں نے آیت "اور تمہارا معبود ایک معبود ہے" پر اعتراضات شروع کیے اور کہا کہ ایک ہی معبود کیسے ہوسکتا ہے، اس کے ساتھ تو بہت سے دوسرے معبود بھی شریک ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انھیں یہیں پکڑا اور پوچھا کہ یہ جو آسمان تمہارے اوپر موجود ہے اور اس پر سورج اور چاند جڑے ہوئے ہیں جن کا آسمان پر اللہ کے حکم سے چلتے رہنا زمین پر تمہاری روزی کے سامان مہیا کرنا ہے، تمہاری کھیتیاں خشک ہوچکی ہوتی ہیں اور پھر ایک دم بادل اٹھتے ہیں اور تمہارے لیے آب حیات بن کر برستے ہیں، طرح طرح کے چوپائے روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں اور تم ان سے مختلف النوع منافع حاصل کرتے ہو، ہوائیں اٹھتی ہیں، کبھی تمہارے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں اور کبھی جب تمہاری نافرمانیاں بڑھ جاتی ہیں تو تم پر عذاب بن کر بہتی ہیں، بادل آسمان و زمین کے درمیان مقید ہیں اور اللہ کے حکم کے بغیر ایک انچ بھی حرکت نہیں کرسکتے، کیا یہ تمام چیزیں، جن کا تم اپنی زندگی میں ہمیشہ مشاہدہ کرتے ہو، اللہ کے سوا تمہارے بت اور دوسرے معبود بھی پیدا کرسکتے ہیں، اگر ان کے بس سے باہر ہے تو پھر تم انھیں اللہ کے ساتھ عبادت میں آخر کیوں شریک کرتے ہو؟ ان آیات میں اسی مخصوص عقیدہ رکھنے والے طبقہ کو خطاب ہے، جو لوگ سرے سے اللہ ہی کو نہیں مانتے، یا جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مخلوقات کو پیدا کرکے اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) معطل ہوگیا اور اب دوسری طاقتیں کائنات پر قابض و متصرف ہیں، ان آیات میں انھیں خطاب نہیں ہے، اگرچہ غور و فکر کی حد تک ہر شخص کے لیے ان میں دعوت موجود ہے اور بہر حال کائنات اپنے پیدا کرنے والے کی قدرت اور اس کی بے مثل اور بے نظیر ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ

اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت

اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ

اللہ سے (رکھنا ضروری) ہے اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔ اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں کسی)

الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ○ اِذْ

مصیبت کو دیکھتے تو اسکے وقوع میں غور کرکے سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور یہ سمجھ لیا کرتے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) اور بھی سخت ہوگا جبکہ

Marfat.com

تَبَرَّأَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ

وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے صاف الگ ہوجاویں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور سب عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے اور باہم ان میں

بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ

جو تعلقات تھے اس وقت سب قطع ہوجاویں گے اور (جب) یہ تابع لوگ یوں کہنے لگیں گے کہ کسی طرح ہم سب کو ذرا ایک دفعہ (دنیا میں) جانا ملجاوے تو ہم

كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ

بھی ان سے صاف الگ ہوجاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے اللہ تعالیٰ یوں ہی ان کی بداعمالیوں کو خالی ارمان کرکے انکو دکھلا دینگے

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝ ع

اور ان کو دوزخ سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا۔

جب عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ"۔ اَنْدَادًا، نِدٌّ کی جمع ہے بمعنی برابر، مثل۔ اس لفظ کی تحقیق ہم پہلے کر آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ "جن لوگوں نے اللہ کے بہت سے شریک بنا رکھے ہیں وہ ان خود ساختہ شرکاء سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے مومنین اللہ سے محبت کرتے ہیں"۔ پھر ارشاد ہے کہ "اللہ سے مومنین کی محبت اس سے بہت بڑھی ہوئی ہے جو مشرکین کو اپنے بتوں سے ہے"۔

"اَنْدَادًا" سے آیت میں کیا مراد ہے؟، اس سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ قتادہ، مجاہد، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ بت اور مشرکین کے دوسرے معبود ہیں جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کیا کرتے تھے۔ ارشاد ہے کہ اپنے ان معبودوں سے وہ ایسی محبت کرتے ہیں جیسے مومنین کو اللہ سے ہے، لیکن اللہ کی محبت میں مومنین ان پر بہت فائق ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ سردار ہیں جن کی تمام مشرکین اللہ کی معصیت میں اطاعت کیا کرتے تھے۔ یہ قول سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوا ہے۔

"وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ"۔ اہل مدینہ اور شام کی عام قراءت میں بجائے "لَوْ يَرَى" کے "لَوْ تَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" ہے، مخاطب کے صیغے کے ساتھ۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کاش، اے محمد! آپ ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور کفر کا راستہ اختیار کیا، اس وقت دیکھتے جب وہ اللہ کے عذاب کا مشاہدہ کریں گے یعنی آپ دیکھتے کہ اس عالم میں وہ کس طرح اللہ کی ربوبیت اور وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں۔ اس صورت میں "لَوْ" کا جواب چھوڑ دیا گیا کیونکہ آیت سے خود واضح تھا۔ اس صورت میں یہ بھی جواب ہوسکتا ہے کہ "پھر آپ کو بھی اللہ کے عذاب کا اندازہ ہوتا کہ کتنا شدید ہے"۔ آگے ارشاد ہے کہ بے شک ساری کی ساری قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کا عذاب بہت ہی سخت ہے۔ یا یہ کہ وہ کہیں گے کہ ساری کی ساری قوت اللہ کے لیے ہے الخ اس قراءت کی بنیاد پر جواب "لَوْ" کی اور کئی صورتیں ہیں جو مذکورہ بالا مفہوم کے قریب قریب ہی ہیں۔ دوسری قراءت میں

Marfat.com

"ولو یری الذین ظلموا" غائب کے صیغہ کے ساتھ ہے مطلب یہ ہوگا کہ "کاش ظالم وہ عذاب دیکھ لیتے جو اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ ساری کی ساری قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور بلاشبہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے" یہ مفہوم کوفہ، بصرہ اور مکہ کے علماء قراءت کے مطابق ہے۔ میرے نزدیک پہلی قراءت "ولو تری" مخاطب کے ساتھ زیادہ بہتر ہے، اور مفہوم یہ ہوگا "کاش، آپ ظالموں کو اس وقت دیکھتے جب وہ عذاب الٰہی کو دیکھ لیں گے، تو اس وقت آپ کے بھی مشاہدہ میں یہ بات آ جاتی کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے"، اس صورت میں "ان القوۃ" سے پہلے "لرأیت" محذوف مانا جائے گا۔ "لو تری" مخاطب کے صیغہ کو ہم نے اس لیے ترجیح دی ہے کہ جو لوگ اس عذاب میں مبتلا ہوں گے وہ تو ظاہر ہے کہ اس کا مشاہدہ کریں گے اور اسے دیکھیں گے، سوال اگر پیدا ہو سکتا ہے تو دوسروں کے جاننے کا ہو سکتا ہے جو اس سے دور رہیں گے۔

"اذ یرون العذاب" یعنی جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے، مشاہدہ کر لیں گے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ "الذین ظلموا" "جنہوں نے ظلم کیا"، سے وہی لوگ مراد ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا اور جن کے متعلق کہا گیا کہ اپنے جھوٹے معبودوں سے اس طرح محبت رکھتے ہیں جیسے اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے یعنی قیامت کے دن جب وہ میرے عذاب کو دیکھ لیں گے تب انھیں معلوم ہوگا کہ قوت ساری کی ساری میرے ہی لیے ہے اور میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے، اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ ان کے یہ جھوٹے معبود انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اس دن ان ظالموں کی ساری مصیبت کی جڑ انھیں کی پرستش اور عبادت ہوگی۔

کشمکش کا عالم

"اذ تبرأ الذین اتبعوا من الذین اتبعوا ورأوا العذاب" (جب مقتدا اور رہنما اپنے مقتدیوں اور پیروؤں سے الگ ہو جائیں گے، اور وہ عذاب دیکھ لیں گے) آیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ قتادہ، ربیع اور عطاء رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ مراد کفر و شرک کے رہنما اور مقتدا ہیں کہ وہ قیامت کے دن اپنے پیروؤں اور ان تمام لوگوں سے جنھوں نے ان کی پیروی کی تھی، اپنی براءت اور علیحدگی کا اظہار کریں گے اور سب کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد "شیاطین" ہیں جن کی مشرکین اتباع کرتے ہیں یعنی وہ اپنی اتباع کرنے والے انسانوں سے الگ ہو جائیں گے اور براءت ظاہر کریں گے۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک میں جو لوگ رہنمائی کا فرض انجام دے رہے تھے، جب وہ اللہ کا عذاب دیکھیں گے تو اپنے پیروؤں سے براءت ظاہر کریں گے۔ آیت میں کسی طرح کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تمام وہ لوگ اس میں آ جاتے ہیں جو کفر اور گمراہی میں رہنمائی کا فرض انجام دیتے تھے، کہ جب وہ اللہ کا عذاب دیکھ لیں گے تو پھر اپنی اتباع کرنے والوں سے براءت ظاہر کریں گے اور ان سے الگ ہو جائیں گے۔ لیکن بہرحال اس سے پہلے کی آیات میں خصوصیت کے ساتھ مشرکین کا ذکر چل رہا تھا جنھوں نے اللہ کے ساتھ بہت سے شریک بنا رکھے تھے، اس لیے اس آیت میں بھی خصوصی خطاب انھیں سے ہے، اگرچہ آیت اپنے معنیٰ اور مفہوم کے اعتبار سے عام ہے اور گمراہی کے تمام ہی رہنما اس میں آ جاتے ہیں۔

اس سے یہ بھی بات صاف ہو جاتی ہے کہ پچھلی آیت میں "انداداً" کی تفسیر میں سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح تھا کہ اس سے مراد انسان ہی ہیں، کفر و شرک کے رہنما جن کی عام مشرکین اللہ کی معصیت اور اس کے کفر میں اطاعت کرتے

Marfat.com

تھے یعنی مشرکین معصیت اور کفر میں اپنے سرداروں کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جیسے مومنین اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیت میں اُن کا یہ قول غلط ہے کہ ”اَلَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا“ سے مراد شیاطین ہیں، کہ وہ اپنی اتباع کرنے والے انسانوں سے قیامت میں برارت کریں گے، کیونکہ سیاق میں اللہ کے شریک بنانے والوں کا ذکر ہے۔

”وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ“ ”اور جب ان کے ”اسباب“ ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔“ ”اَسْبَاب“ کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد دنیا میں سرداروں اور ان کی اقتدا کرنے والوں کا تعلق ہے، کہ قیامت میں جب وہ اللہ کا عذاب دیکھ لیں گے تو ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید تفصیل فرمائی کہ شرم دحیا کے بندھن (اسباب) قیامت میں ٹوٹ جائیں گے اور دنیا کے معاہدوں کا جو وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کے لیے کرتے تھے، کوئی پاس ولحاظ نہ رہے گا، بلکہ اس کے بدلہ میں قیامت کے دن وہ باہمی عداوت اور دشمنی کا مظاہرہ کریں گے، ایک دوسرے سے برارت کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ”اَسْبَاب“ سے مراد آیت میں دنیا میں ان کی عزت اور ان کا مرتبہ ومنزلت ہے، کہ قیامت میں وہ باقی نہ رہے گی۔ تیسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مراد ”صلہ رحمی“ ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ”اسباب“ سے مراد وہ اعمال ہیں جنھیں یہ لوگ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ یہ قول سدی اور ابن زید رحمہما اللہ سے نقل ہوا ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ قیامت کے دن اہل تقویٰ کو ان کے اعمال کا ایک وثیقہ دیا جائے گا، وہ ان کی نجات کا پروانہ ہوگا لیکن بُرا عمل کرنے والوں کو ان کے بُرے اعمال کا وثیقہ ملے گا، وہ ان کے عمل کے سلسلے کے خاتمہ کی نشانی ہوگی اور انھیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

”اَسْبَاب“ ”سبب“ کی جمع ہے، اور ہر اس چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز حاصل کی جا سکے۔ راستہ بھی اسی لیے ایک ”سبب“ ہے کہ منزلِ مقصود تک اسی کے ذریعہ پہنچا جا سکتا ہے، اسی لیے رشتہ دامادی حرمت کا ”سبب“ ہے، وغیر ذلک۔ جب ”سبب“ کا اصل معنیٰ یہ ہے تو زیر تفسیر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کے تمام اسباب اور وسیلے قیامت کے دن ختم ہو جائیں گے۔ آیت میں بھی اس کا ذکر ہے کہ جب عذاب دیکھ لیں گے تو قائد اور رہنما خود اپنے پیرووں سے برارت ظاہر کرنے لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اس وقت ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ مختلف مقامات پر مختلف آیات میں قیامت کے دن کفار کی بے چارگی کا ذکر ہے کہ ان میں کوئی بھی ایک دوسرے کی مدد کو نہیں آئے گا، جو دنیا میں باہم دوست رہے ہوں گے وہ بھی وہاں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، قرابت اور رشتہ داریوں کو بھی کوئی نہیں پہچانے گا۔ ایک موقعہ پر ارشاد ہے کہ قیامت میں انھیں کھڑا کر کے سوال کیا جائے گا کہ آج کیا بات ہے، تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی صرف وعدہ پورا کرنے کے لیے اپنے والد کے بارے میں اللہ رب العزت سے استغفار کریں گے، پھر جب ظاہر ہو جائے گا کہ وہ اللہ کے دشمن ہیں تو اللہ کے حضور میں اس سے برارت کریں گے۔ یہ تمام چیزیں دنیا کے اسباب میں لوگوں کے دنیاوی مقاصد کے پورا کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن قیامت کے دن کفار کے لیے اس طرح کے تمام ذریعے اور وسیلے منقطع ہو جائیں گے اور کوئی ان کے لیے ”سبب“ نجات نہیں بن سکے گا۔ اور یہی تمام چیزیں آیت میں ”اسباب“ سے مراد ہیں جن کا ایک اجمالی ذکر اوپر کیا گیا اور جو قیامت میں کفار کے لیے کارآمد ہو سکتی تھیں، لیکن ان کے اعمال کی وجہ سے ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

"وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا" یعنی مقتدین اور اتباع کرنے والے جنھوں نے اللہ کے مقابلہ میں اپنے سرداروں کی اطاعت کی تھی، اللہ کا عذاب دیکھ کر کہیں گے، کاش ہمیں پھر ایک دفعہ جانے کا موقعہ مل جاتا "کَرَّةً" سے مراد دنیا کی طرف واپسی ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر نقل ہوئی ہے، یعنی "ہمیں اگر دنیا میں ایک دفعہ پھر جانے کا موقعہ مل جائے تو ہم بھی ان سے الگ ہو جائیں، جیسے اب یہ ہم سے الگ ہو گئے ہیں" مطلب یہ ہے کہ اب اتباع کرنے والے اور مقتدی علٰحدگی کی خواہش کا اظہار کریں گے کہ اگر انھیں دنیا میں دوبارہ جانے کا موقعہ دے دیا جائے تو کفر اور گمراہی کے سرداروں سے کامل علٰحدگی اختیار کر لیں گے اور اللہ کی آیات اور اس کے رسول کی تکذیب نہیں کریں گے لیکن اب پانی سر سے گذر چکا ہو گا، عذاب ان کے سامنے ہو گا اور ان کی یہ خواہش پوری نہیں کی جائے گی۔

"كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ" (اسی طرح اللہ انھیں ان کے اعمال خالی حسرت کر کے دکھائے گا) یعنی جس طرح اللہ قیامت کے دن انھیں عذاب دکھائے گا، اسی طرح ان کے برے اعمال حسرت اور ندامت بن کر ان کے سامنے آئیں گے اور انھیں ان پر سزا ملے گی۔ "حَسَرَاتٍ" "حَسْرَةٌ" کی جمع ہے بمعنی ندامت۔ کہا جاتا ہے کہ "حَسْرَة" ندامت کا انتہائی درجہ ہے۔ آیت کے مفہوم کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔

ایک قول کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ "جو اعمال ان پر دنیا میں فرض تھے، لیکن ان پر انھوں نے عمل نہیں کیا، بلکہ ضائع کر دیا، اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق عمل کرتے تو انھیں آخرت میں جنت اور اس کی نعمتیں حاصل ہوتیں، وہ دوسرے لوگوں کو دیکھیں گے جنھوں نے اللہ کے احکام پر عمل کیا ہو گا کہ انھیں وہ تمام نعمتیں حاصل ہیں جو اللہ نے اپنے فرمانبردار بندوں کیلئے تیار کر رکھی ہیں اور جن کا اللہ کی طرف سے پہلے سے وعدہ تھا، اس وقت ان کا حشر ان کے سامنے ہو گا اور انھیں حسرت و ندامت کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو گا وہ سوچیں گے کہ اگر انھوں نے بھی دنیا میں کچھ کر لیا ہوتا اور اللہ کی نافرمانی سے باز آ جاتے تو ان کا آج یہ حشر نہ ہوتا" سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن جنت کافروں کے سامنے کر دی جائے گی اور وہ اس کے محلات کو دیکھیں گے، اس وقت انھیں اپنی دنیا کی زندگی پر حسرت و ندامت ہو گی کہ کاش، اگر انھوں نے دنیا میں اللہ کی طاعت کی ہوتی تو انھیں بھی ان نعمتوں سے نوازا جاتا۔ یہی وقت ان کی ندامت کا ہو گا۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ کے سلسلے میں روایت ہے کہ قیامت میں ہر شخص جنت اور دوزخ کے گھروں کو دیکھے گا۔ یہی حسرت کا دن ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ جہنمی جب جنتیوں کو دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ کاش، تم نے بھی ان کے جیسے اعمال کیے ہوتے۔ اس وقت انھیں حسرت ہو گی۔ اسی طرح جب جنتی جہنم کو دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اگر اللہ کا احسان تم پر نہ ہوتا تو تم بھی نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے۔

سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جو عمل انھوں نے سرے سے کیا ہی نہیں وہ انھیں کس طرح حسرت و ندامت کر کے دکھایا جائے گا؟ انھوں نے تو تمام اعمال برے کیے، پھر ان کی طرف نیک اعمال کی نسبت کیسے کر دی گئی، جو انھیں قیامت کے دن حسرت کر کے دکھائے جائیں گے؟ اس سوال کا حل یہ ہے کہ جب ایک شخص کے سامنے ایک کام رکھا جائے تو اس پر عمل سے پہلے بھی اس کی طرف نسبت کی جا سکتی اور کہا جا سکتا ہے کہ "یہ تمہارا کام ہے" مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تمہارا وہ کام ہے جو تمھیں کرنا ہو گا۔ کسی کے سامنے دوپہر کا کھانا رکھا گیا، تو کھانے سے بھی پہلے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمہارا دوپہر کا کھانا ہے۔ آیت میں بھی یہی صورت ہے کہ جو اعمال ان پر ضروری قرار دیے گئے تھے وہ انھیں حسرت کر کے دکھائے جائیں گے یعنی ان کے نہ کرنے پر انھیں حسرت و ندامت ہو گی۔

Marfat.com

دوسرا قول یہ ہے کہ "ان کے بُرے اعمال اللہ تعالیٰ انھیں قیامت کے دن حسرت کر کے دکھائیں گے، یعنی قیامت میں انھیں حسرت و ندامت ہوگی کہ انھوں نے کیوں اس طرح کے اعمال کیے، کیوں نہ انھوں نے وہ اعمال کیے جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کا باعث بنتے"۔ یہ قول ربیع اور ابن زید رحمہما اللہ سے نقل ہوا ہے، اور آیت کی تفسیر میں میرے نزدیک یہی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ آیت کے الفاظ سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کو اگرچہ غلط نہیں کہا جا سکتا، آیت میں اس کی بھی گنجائش ہے، لیکن قرآن کے واضح اور صاف مفہوم کو چھوڑ کر اندر سے بات نکالنے کی کوشش مناسب نہیں ہے۔

"وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ" اور وہ دوزخ سے کبھی نکلنے نہیں پائیں گے، یعنی وہی لوگ جن کا اوپر ذکر ہوا، اگرچہ وہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر اپنے بُرے اعمال پر بڑی ندامت محسوس کریں گے اور کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں ایک مرتبہ اور جانا مل جائے تو وہاں پہنچ کر ہم ضرور اچھے اعمال کریں گے، لیکن اس وقت انھیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائیگی، ان کی ندامت و حسرت اور اللہ کی معصیت سے باز آجانے کے عزم کا اظہار، کوئی چیز انھیں دوزخ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی، اب وہی ان کا ہمیشہ کے لیے ٹھکانا ہے۔ اس آیت میں ایسے لوگوں کی کھلی تردید موجود ہے جو یہ کہتے ہیں کہ کفار پر دوزخ کا عذاب ہمیشہ نہیں ہوگا، بلکہ ایک متعینہ مدت کے بعد انھیں بھی دوزخ سے نکال دیا جائے گا۔ آیت میں صاف الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ "وہ دوزخ سے کبھی نہیں نکل پائیں گے"۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

اے لوگو جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال پاک چیزوں کو کھاؤ (برتو) اور شیطان کے قدم بقدم

الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

مت چلو فی الواقع وہ تمہارا صریح دشمن ہے وہ تو اُن کو ان ہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (شرعاً) بُری اور گندی ہیں

وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا

اور یہ (بھی) تعلیم کرے گا کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ کہ جس کی تم سند بھی نہیں رکھتے اور جب کوئی اُن (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم

أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ

بھیجا ہے اس پر چلو تو کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا اگرچہ ان کے باپ دادا

آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ○ وَمَثَلُ الَّذِينَ

(دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس

كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ

(جانور) کی کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا

Marfat.com

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ○

(اسی طرح) یہ کفار بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو کچھ نہیں سمجھتے۔

حلت وحرمت اللہ کے حکم پر موقوف ہے

"یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" یعنی اے لوگو، وہ چیزیں کھاؤ جو میں نے تمہارے لیے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حلال کی ہیں، ان چیزوں کو بھی حلال سمجھو جنھیں تم نے ازخود میری طرف سے حرمت کے حکم کے بغیر اپنے اوپر حرام کرلیاہے، مختلف قسم کے وہ جانور جنھیں تم بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اب ان کا کسی حیثیت سے استعمال تمہارے لیے جائز نہیں، اگر میری طرف سے پہلے سے ان کے متعلق حرمت کا کوئی حکم نہیں تو وہ حرام نہیں ہوسکتے، وہ حلال ہی ہیں۔ اسی طرح جن چیزوں کا کھانا میں نے تمہارے لیے حرام کردیا ہے وہ تمہارے حلال کرنے سے حلال نہیں ہوسکتے، حرام ہی رہیں گے۔ اور شیطان کے نقش قدم پر چلنا چھوڑ دو، کہ وہ تمھیں ہلاک وبرباد کردے گا۔ "اِنَّهٗ" کی ضمیر سے مراد شیطان ہے، یعنی اے لوگو، شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، اس کی تمہارے ساتھ دشمنی اس سے ظاہر ہے کہ اس نے تمہارے جدامجد آدم علیہ السلام کو سجدہ سے انکار کیا، اور اس سلسلے میں اللہ کے حکم کی بھی پروا نہیں کی، پھر ان کے پیچھے لگا رہا، اور آخرکار انھیں جنت سے نکال کر چھوڑا۔ اس لیے اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم سمجھ سے کام لو اور اس کے نقش قدم پر نہ چلو، بلکہ میرا بتایا ہوا راستہ اختیار کرو اور صرف میری حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھو اور میری ہی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام جانو۔ یہ جو تم خود سے اپنے لیے چیزوں کو میرے حکم کے بغیر حلال اور حرام کرلیتے ہو، یہ بھی شیطان کی ہی پیروی کا نتیجہ ہے۔ "حَلَال" یعنی آزاد ہے، "حَلَّ لَكَ هٰذَا الشَّیْءُ" یعنی تم اس چیز کے استعمال میں آزاد ہو۔ "طَیِّب" یعنی پاک، جو نہ نجس ہو نہ حرام۔ "خُطُوٰتِ"، "خُطْوَة" کی جمع ہے "خطوتُ خُطْوَةً وَاحِدَةً" میں ایک قدم چلا، سے ماخوذ ہے، مقصد شیطان کا راستہ اختیار کرنے اور اس کے نقش قدم پر چلنے سے منع کرنا ہے کہ وہ اللہ کی طاعت وبندگی کے خلاف راستہ ہے۔ علماء مفسرین کے "خُطُوٰت" کے معنی کے سلسلہ میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے "خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" کا مفہوم "شیطان کا عمل" نقل ہوا ہے، کہ اس کی اتباع نہ کرو۔ مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے "خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" سے "شیطان کی نافرمانیاں اور اس کی گمراہیاں" منقول ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد "شیطان کی اطاعت" ہے۔ ابومجلز رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ "گناہ کے کاموں میں نذر نہ مانو"۔

آیت کی تفسیر میں یہ تمام اقوال مفہوم ومعنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں، اور سب کا حاصل ایک ہی ہے کہ شیطان کی پیروی نہ کرو اور اس کے راستے پر نہ چلو۔ لفظ "خُطُوٰت" کا جہاں تک تعلق ہے تو جیساکہ ہم نے اس کی وضاحت بھی کی، خُطْوَةٌ کی جمع ہے اور اس کا اصل معنی ہے "دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ"، لیکن اس کا استعمال عام ہے اور راستہ اور آثار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" یعنی شیطان تمہیں صرف برائی اور گندگی کا حکم دیتا ہے اور اس کا کہ تم اللہ پر ایسی باتیں گھڑ لو جن کا تم علم نہیں رکھتے۔ "السُّوْٓءُ" وہ برا کام جو نقصان دہ

Marfat.com

ہو۔ بولتے ہیں "یَسُوْءُکَ ھٰذَا الْاَمْرُ" یعنی یہ کام تمھیں نقصان دے گا۔ "اَلْفَحْشَاءُ" مصدر ہے، ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جس کا تذکرہ فحش سمجھا جاتا ہو اور جس کا سننا ناگوار ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آیت میں "اَلسُّوْءُ" سے مراد اللہ کی نافرمانی ہے۔ اسے "سوء" اس لیے کہا گیا کہ اس کا کرنے والا انجام اور عاقبت کے اعتبار سے نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "اَلْفَحْشَاءُ" سے مراد زنا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس کا سننا ناگوار ہوتا ہے اور اس کے تذکرہ کو پسند نہیں کیا جاتا۔ سدی رحمہ اللہ سے یہی معنی منقول ہیں۔

"وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" سے مراد وہ جانور ہیں جنھیں مشرکین عرب بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور ان کا استعمال اپنے لیے حرام سمجھتے تھے، یعنی بحیرہ[۱]، سائبہ، وصیلہ اور حامی۔ اسی کا ذکر ایک موقعہ پر صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ "مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنْ بَحِیْرَۃٍ وَّلَا سَآئِبَۃٍ وَّلَا وَصِیْلَۃٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰکِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ" (اللہ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو، البتہ جو لوگ کافر ہیں وہی اللہ پر جھوٹ جوڑتے رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام ہی نہیں لیتے)۔ اس آیت کا بھی مطلب یہی ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ آیت میں مذکور جانوران کے لیے اللہ نے حرام کیے ہیں سراسر غلط بیانی اور جھوٹ ہے، یہ تو شیطان کے دھوکے میں مبتلا ہیں، اللہ نے انھیں ان کے لیے حلال اور جائز کیا ہے، لیکن وہ اللہ کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں جس کا انھیں علم نہیں ہے۔ ان کی اس گمراہی کی جڑ شیطان کی اتباع اور اس کے احکام کی پیروی ہے، اس معاملے میں وہ اپنے آباء واجداد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، جیسا کہ آگے کی آیت میں مذکور ہے۔

سوچنے کا غلط انداز

"وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ" آیت کی تفسیر دو طریقوں سے کی گئی ہے ایک یہ کہ "اِذَا قِیْلَ لَھُمْ" میں "لَھُمْ" کی ضمیر سے اس سے پہلے کی آیت میں مذکور "اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی شریک بنائے ہوئے ہیں" "لوگ" مراد لیے جائیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔

تفسیر کی دوسری صورت یہ ہے کہ "لَھُمْ" کی ضمیر سے مراد وہ لوگ لیے جائیں جن کا ذکر آیت "اے انسانو، زمین پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ موجود ہے اس میں سے کھاؤ پیو" میں ہے۔ اس صورت میں پہلے تو لوگوں سے براہ راست خطاب تھا، اب خطاب کے بجائے غائب کے صیغے استعمال کیے گئے، اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کلام عرب میں اور خود قرآن مجید

---

[۱] یہ عرب جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ "بحیرہ" اس اونٹنی کو کہتے تھے جو دس بچے جنتی اور آخری نر ہوتا، اس کا کان چیر کر اسے سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاتا۔ "سائبہ" وہ اونٹنی تھی جو کسی دیوتا کے نام پر سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دی جاتی اور اسے چارہ پانی سے نہ روکا جاتا۔ "وصیلہ" یہ بھی مادہ بچے جننے والی اونٹنی ہے جسے دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ "حامی" نر اونٹ کی ایک قسم ہے جسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

Marfat.com

ہیں اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ میرے نزدیک آیت کی تفسیر میں یہی آخری صورت زیادہ بہتر ہے۔ پہلی صورت میں آیت کا تسلسل نہیں باقی رہتا، کیونکہ درمیان میں دوسرے مضامین بھی ہیں۔ آخری صورت میں تسلسل بھی باقی رہتا ہے اور دونوں آیتوں میں کوئی فاصلہ بھی نہیں۔

آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب یہود کو اسلام کی دعوت دی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو رافع بن خارجہ اور خالد بن عوف نے اس کا یہ جواب دیا کہ ہم تو بس اسی راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، کیونکہ وہ ہم سے بہتر تھے اور ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، کہ اگر ان کے باپ دادے عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں، کیا اس صورت میں بھی وہ انھیں کی پیروی کریں گے؟ "اِتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ" جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اس کی پیروی کرو" یعنی اللہ نے جو احکام اپنی کتاب میں اپنے رسول پر نازل کیے ہیں ان کے مطابق عمل کرو، ان چیزوں کو حلال جانو جنھیں اس نے حلال کیا ہے اور جن چیزوں کو اس نے حرام کردیا ہے انھیں تم بھی حرام قرار دو۔
"اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا"، یعنی جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ یہی معنی قتادہ اور ربیع سے منقول ہیں۔

یہودیوں کی مثال

"وَمَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً" "اور جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ایسے (جانور) کے پیچھے چلّا رہا ہے جو کچھ سنتا ہی نہیں، بجز بلانے اور پکارنے کے)۔ آیت کے مفہوم کے سلسلے میں جو مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں، ان میں پہلا قول یہ ہے کہ آیت میں کافر کی مثال کم فہمی اور عدم قبولیت میں دی گئی ہے، یعنی اس کی مثال اس جانور جیسی ہے کہ جب اسے پکارا جاتا ہے تو آواز تو وہ سن لیتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس سے کہا کیا جا رہا ہے۔ یہی حال کافر کا ہے، اللہ کی کتاب جب اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور اللہ کی وحدانیت کو ماننے کی دعوت دی جاتی ہے تو نا سمجھی کا ثبوت دیتا ہے، اس کے لیے بھی یہ دعوت صرف ایک آواز ہے جس کا کوئی مفہوم نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، ربیع، عطاء اور سدی رحمہم اللہ سے اس قول کی روایت ہے۔ ان حضرات کی تفسیر کے مطابق کافروں کی اور انھیں نصیحت کرنے والوں کی مثال چرواہے اور بھیڑ بکریوں سے دی گئی ہے، یعنی جس طرح چرواہے کی آواز کو تو اس کے جانور سن لیتے ہیں، لیکن اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں، یہی حال کافروں کو نصیحت کرنے والوں اور ان کی نصیحت کا ہے، کہ کافر سنتے تو ضرور ہیں لیکن سمجھتے کچھ نہیں۔ نصیحت کرنے والے اور نصیحت کا آیت میں ذکر نہیں، کیونکہ بغیر ذکر کے کلام سے ظاہر ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں کفار کے اپنے معبودوں کو پکارنے کی مثال بیان کی گئی ہے، یعنی کافروں کا اپنے بتوں اور معبودوں کو، جو عقل و فہم سے بالکل عاری ہیں، پکارنا اور ان سے منتیں مانگنا، اس شخص جیسا ہے جو چلا رہا ہو اور بجز بلانے اور پکارنے کے پکارنے والا خود بھی کچھ نہ سمجھتا ہو، یعنی وہ ایک آواز بازگشت ہے جو سنی تو جا سکتی ہے، لیکن سمجھی نہیں جا سکتی۔ یہ تفسیر ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص پہاڑ کے درمیان میں چلاّتا ہے تو اس سے ایک آوازِ بازگشت آتی ہے، اور اسے "صدی" کہتے ہیں، ان کافروں کے معبودوں کی مثال بھی ان کے حق میں اس شخص جیسی ہے جس کے پکارنے اور چلانے کا جواب صرف پہاڑ کی آوازِ بازگشت سے مل جاتا ہے، اور اس کا کوئی نفع نہیں، صرف ایک پکار سنائی دیتی ہے۔ آیت میں ایک اور مطلب کی بھی گنجائش ہے، یعنی یہ کہ "کافروں کے

Marfat.com

اپنے معبودوں کو جو کچھ نہیں سمجھتے، پکارنے کی مثال بھیڑ کو پکارنے والے چرواہے جیسی ہے، کہ وہ بھی چرواہے کی آواز کو نہیں سمجھتی، البتہ پکارنے والا بلا وجہ ہلکان ہوتا ہے، میرے نزدیک بہتر تفسیر پہلی ہے، جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے۔ اس طرح کی مثالیں قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی موجود ہیں۔ ہم نے یہ تفسیر اس لیے پسند کی کہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور وہ بت پرست نہیں تھے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

"صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ" یعنی یہی کفار جن کی مثال اوپر بیان کی گئی "بہرے ہیں" کہ حق کو نہیں سنتے، "گونگے ہیں" کہ حق قبول نہیں کر سکتے اور نہ ان امور کا اقرار کر سکتے ہیں جن کے اقرار کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور جو اُن کے سامنے بالکل صاف اور واضح ہیں۔ اللہ کا حکم تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی صداقت کا لوگوں کے سامنے اعلان کریں، لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔ "اندھے ہیں" حق کے راستہ اور ہدایت سے کہ انھیں دکھائی نہیں دیتا۔ آیت کی یہ تفسیر قتادہ، سدی اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے۔ "فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ" سو وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے جیسے کہتے ہیں "فلاں شخص بہرا ہے، کچھ بھی نہیں سنتا، گونگا ہے کچھ بھی نہیں بول سکتا۔"

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا

اے ایمان والو جو (شرع کی رُو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں اُن میں سے (جو جی چاہے) کھاؤ (اور حق تعالیٰ

لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ

کی شکرگزاری کرو۔ اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی (کا تعلق) رکھتے ہو　اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے　مردار کو

وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر بھی جو شخص

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ (قدر حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم

مسلمانوں سے خطاب

"يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ" آیت کی تفسیر میں ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اے وہ لوگو جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی وہ روزی کھاؤ جو ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہے، گو اس سے پہلے تم اسے حرام سمجھتے چلے آرہے تھے، لیکن اب تمھیں معلوم ہوا کہ وہ تو اللہ کی طرف سے حلال تھی، اور اللہ نے جو تمھیں روزی دی ہے اس پر اس کا اس کی شان کے مطابق شکر ادا کرو، اگر تم واقعی اس کے احکام کے مطابق چلنے والے اور اس کے اطاعت گزار بندے ہو تو پھر تمھیں وہ تمام چیزیں کھانی چاہییں جنھیں تم نے اللہ کے حکم کے بغیر از خود حرام کر لیا تھا، لیکن اب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ

Marfat.com

لیا تھا، حالانکہ اللہ کی طرف سے انھیں حرام نہیں قرار دیا گیا تھا۔ آیت میں انھیں چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ آگے کی آیت کی طرف سے حلال تھیں۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ جاہلیت میں مشرکین نے بہت سی چیزوں کو از خود حرام قرار دے میں ان چیزوں کا ذکر ہے جنھیں واقعی اللہ نے حرام کیا ہے۔

"إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ" یعنی اے اللہ پر ایمان لانے والو، جب تک میرا حکم نہ ہو، از خود کوئی چیز اپنے اوپر حرام نہ کرو، بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جو تم نے اپنے اوپر از خود حرام کیے ہیں، انھیں کھاؤ، کیونکہ میں نے تم پر سوا مردار، خون، سُور کے گوشت اور اپنے سوا دوسرے معبودوں کے لیے نامزد کیے ہوئے جانوروں کے اس طرح کی کوئی چیز حرام نہیں کی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھانے کی چیزوں میں جو تم پر اللہ نے حرام کی ہیں وہ صرف مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے لیے نامزد کیے ہوئے جانور ہیں، اس کے سوا دوسری چیزیں نہیں حرام کی گئی ہیں۔ "مَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ" یعنی جو بتوں اور معبودوں کے لیے ذبح کیا گیا ہو یا ان کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو۔ "أُهِلَّ" کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ جب عرب کسی بت کے نام پر کوئی جانور ذبح کرنا چاہتے تو اس بت کے لیے جانور کو پہلے سے نامزد کر دیتے اور بلند آواز کے ساتھ اپنے اس ارادے کا اظہار کرتے۔ "أُهِلَّ" کا اصل مفہوم ہے، "آواز بلند کرنا"، لیکن بعد میں اسے ہر طرح کے ذبح کے لیے استعمال کرنے لگے، خواہ وہ بتوں کے لیے نامزد کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، بلند آواز کے ساتھ بسم اللہ پڑھی گئی ہو یا نہ پڑھی گئی ہو، ورنہ "اِهْلَال" کا اصل مفہوم تو ان کاموں کے لیے آواز بلند کرنا تھا۔ اسی مناسبت سے حج یا عمرہ کے لیے تلبیہ کہنے والے کے لیے "مُهِلّ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ بھی بلند آواز سے تلبیہ کہتا ہے، پیدائش کے وقت بچے کی ہلکی سی چیخ کے لیے بھی "اِسْتِهْلَال" استعمال کرتے اور بارش کے زمین پر گرنے کی آواز کو "اِسْتِهْلَالُ الْمَطَرِ" کہتے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، مجاہد، ضحاک اور عطاء رحمہم اللہ "مَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ" کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ "ہر وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ذبح کیا گیا ہو"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ کو چھوڑ کر، ہر وہ ذبیحہ جو اہل کفر نے غیر اللہ کے لیے کیا ہو" (حرام ہے)۔ قتادہ نے فرمایا کہ جو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو اور جس پر کسی کا نام لیا گیا ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "وہ جس پر اللہ کے سوا دوسرے کسی کا نام لیا گیا ہو"۔ ربیع، ابن زید، عقبہ بن مسلم اور قیس بن رافع رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ مراد وہ جانور ہیں جو مشرکین اپنے بتوں کے نام پہ ذبح کرتے تھے اور ان کے لیے نامزد کرتے تھے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ یہ جانور اللہ کے نام کا ہے، وہ کہتے تھے کہ یہ جانور فلاں بت کے نام کا ہے اور اسی کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔ عقبہ بن مسلم اور قیس بن رافع سے نقل ہے کہ انھوں نے فرمایا، عید کنائس کے موقعہ پر جو جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور اس موقعہ پر جو روٹی اور گوشت ہدیہ کے طور پر بھیجا جاتا ہے، وہ ہمارے لیے حلال ہے، کیونکہ وہ اہل کتاب کا کھانا ہے۔ "مَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ" میں مجوسیوں، بت پرستوں اور مشرکوں کے ذبیحہ کا ذکر ہوا ہے، کہ اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

"فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ" یعنی جو شخص بھوک سے مضطر ہو کر ان چیزوں کے کھانے پر مجبور ہو جائے جو حرام ہیں، جیسے مردار، خون، سُور کا گوشت اور غیر اللہ کے لیے نامزد کیے ہوئے جانور، اگر کوئی مجبوری کی ایسی حالت میں پہنچ جائے تو ان حرام چیزوں کے کھانے میں بھی کوئی گناہ نہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کھانے میں وہ

Marfat.com

نہ بے حکمی کرنے والا ہو اور نہ حد سے نکل جانے والا ہو۔ "غَیْرَ بَاغٍ" حال ہے۔ "اُضْطُرَّ"۔ "ضَرُوْرَۃ" سے افتعال کا صیغہ ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "فَمَنِ اضْطُرَّ"، کا مفہوم یہ ہے کہ زبردستی کر کے مجبور کر دیا گیا اور پھر کھا لیا تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل ہے، یعنی کسی کو اس کے کسی دشمن نے پکڑ کر اللہ کی معصیت پر مجبور کر دیا۔

"غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کے مفہوم کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ بغیر کسی ظلم کے امت اور حکمراں کے خلاف بغاوت کے لیے نکلنے والا نہ ہو۔ "وَلَا عَادٍ" یعنی اللہ کی معصیت کے لیے نکلنے والا، فساد اور لڑائی کے ذریعہ مسلمانوں کے راستوں کو پرخطر بنانے والا اور ظلم کرنے والا نہ ہو۔ یعنی اگر ان کاموں کے لیے وہ نکلا اور پھر حالات نے مجبور کر دیا، فاقوں سے جان کے لالے پڑ گئے اور حرام غذا کے سوا کوئی چیز کھانے کے لیے نہیں تو آیت میں مذکورہ اجازت کے حکم سے ایسا شخص خارج ہے، اس پر اس حالت میں بھی حرام کھانے اور حرام مشروبات حرام ہی رہیں گی لیکن اگر کوئی شخص ان برے کاموں میں نہیں مبتلا ہے اور اس پر مجبوری اور بے بسی کا وقت آپڑتا ہے تو وہ بھوک اور پیاس کی حالت میں کھانے پینے کی حرام چیزیں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ مجاہد اور سعید رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہوا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" یعنی اس کھانے میں اس کا مقصد طلب حرام نہ ہو، اور نہ کھانے میں اس حد سے تجاوز نہ کرے، جس کی اس کے لیے اجازت ہے۔ قتادہ، حسن، عکرمہ، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے

تیسرا قول یہ ہے کہ "کھانے میں طلب لذت اور کھانے والے کی نفسانی خواہش کو دخل نہ ہو، اور نہ ضرورت سے زیادہ کھائے"۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل ہے، آپ نے فرمایا کہ حرام کھانے سے پیٹ نہ بھرنا چاہیے، بلکہ صرف اتنا کھانا چاہیے کہ زندگی کی ضروریات کے لیے کام کر سکے۔

بہتر تفسیر آیت کی میرے نزدیک یہ ہے کہ "غَیْرَ بَاغٍ" یعنی مقصد طلب حرام نہ ہو، "وَّلَا عَادٍ" اور نہ اس کھانے میں حد سے تجاوز کرنے والا ہو، یعنی اگر کھانے کی کوئی حلال چیز موجود ہے تو حرام کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو خودکشی اور اپنی جان ضائع کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگر کوئی شخص گناہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے، اس کا مقصد امام حق کے خلاف بغاوت ہے، یا راستوں پر ڈاکے وغیرہ ڈالنا ہے تو یقیناً یہ سب کام گناہ ہیں اور ان کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہے، لیکن بہرحال یہ حکم اب بھی اس کے لیے باقی ہے کہ اپنی جان کو جان بوجھ کر ہلاکت میں نہ ڈالے، اگر پھر بھی وہ خود کو ہلاک کرتا ہے تو وہ دوہرے جرم کا مجرم ہے۔ اس لیے جس طرح دوسروں کو حرام کھانا بحالت اضطرار کھانا چاہیے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ بحالت اضطرار حدود کے اندر رہتے ہوئے حرام کھانے کا استعمال کرے۔ آخری تفسیر کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہماری پسندیدہ دوسری تفسیر کے مفہوم میں یہ بھی آجاتی ہے۔ "فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ" یعنی اگر مذکورہ بالا حالات میں کوئی شخص حدود کی رعایت کرتے ہوئے کھاتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں

"اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" یقیناً اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں، کہ اگر تم نے خلوص کے ساتھ، جاہلیت کے راستے کو چھوڑ کر، صرف اللہ ہی کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام جانا تو وہ تمہارے پچھلے تمام گناہ معاف کر دے گا، اور وہ تم پر بڑا رحم کرنے والا ہے کہ اس نے تمہیں مجبوری اور اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی بھی اجازت دی ہے۔

Marfat.com

ابن جریر

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں (دنیا کا)

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ

متاع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کرکے) انکی صفائی کریں گے۔ اور ان کو سزائے دردناک ہوگی

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ

یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا)

فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ

سو دوزخ کے لیے کیسے باہمت ہیں یہ (ساری مذکورہ سزائیں ان کو اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝

ٹھیک بھیجا تھا اور جو لوگ (ایسی) کتاب میں بے راہی کریں وہ بڑے دور کے خلاف میں ہوں گے۔

شوخ چشمی

"إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا" مراد یہودی علماء ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے معاملہ کو چھپایا تھا، حالاں کہ آں حضورؐ کے متعلق ان کی آسمانی کتاب تورات میں لکھا ہوا موجود تھا۔ قتادہ، ربیع، سدی اور عکرمہ رحمہم اللہ سے یہی منقول ہے کہ مراد اہل کتاب ہیں۔ "یَشْتَرُوْنَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا" یعنی آں حضورؐ کی نبوت اور آپ کی صداقت کو معمولی معاوضہ کے بدلہ میں چھپاتے ہیں اور دنیا کی معمولی پونجی کے پیچھے اتنا بڑا جرم کر گذرتے ہیں۔ اسی مضمون کی آیت اس سے پہلے بھی گذر چکی ہے اور وہاں ہم نے تفصیلات لکھدی ہیں۔

"أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" یعنی یہی لوگ جو آں حضورؐ کی نبوت کو معمولی معاوضہ کے بدلہ میں چھپاتے ہیں اور اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹ میں بس آگ بھرتے ہیں، یعنی اللہ کی کتاب میں تبدیلی کے بدلہ میں جو معاوضہ انھیں ملتا ہے وہی انھیں جہنم میں داخل کرے گا۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ "وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" اللہ ان سے قیامت کے دن کلام نہ کرے گا، یعنی ایسا کلام نہیں کرے گا جو انھیں پسند ہوگا یا جس کی انھیں آرزو ہوگی، لیکن انھیں سزا دینے کے لیے یا ایسا کلام جو انھیں ناپسند ہو، کرے گا۔ قرآن کی آیات سے یہی ثابت ہے کہ اللہ ان سے بھی کلام کرے گا لیکن وہ جو ان کی خواہش اور آرزو کے خلاف ہوگا۔ "لَا يُزَكِّيهِمْ" یعنی ان کے گناہوں اور ان کے کفر سے "انھیں پاک نہیں کرے گا"۔ "وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

Marfat.com

"اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ" یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں خرید لیا ہے "یعنی ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کر لی ہے، وہ راستہ چھوڑ دیا جو اللہ کی مغفرت و رضوان کا باعث بنتا، اس کے بجائے وہ راستہ اختیار کیا جو اس کے غضب اور عذاب کو دعوت دیتا ہے۔

"فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ" (اور یہ لوگ کیسی جیوٹ رکھتے ہیں دوزخ کے لیے) اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ "اوران لوگوں کو ایسے اعمال کرنے کی جو انھیں دوزخ کی طرف لے جا رہے ہیں کیسی جرأت ہوگئی ہے"۔ قتادہ، حسن اور ربیع اور مجاہد یا سعید بن جبیر سے اس کی روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "انھیں اہلِ دوزخ کے اعمال کرنے پر کس چیز نے آمادہ کر رکھا ہے"۔ یہ قول بھی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔ "فَمَآ" میں جو "مَآ" ہے اس کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ استفہام (سوال) کے لیے ہے یعنی دوزخ کے لیے انھیں کس چیز نے آمادہ صبر کر رکھا ہے؟۔ مجاہد، سدی، عطاء، ابوبکر بن عیاش اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "مَآ" تعجب اور اظہارِ حیرت کے لیے ہے یعنی دوزخ کے لیے یہ لوگ کیسی جیوٹ رکھتے ہیں، ان میں کیسی (بے جا) جرأت ہے کہ دوزخیوں کے کام کرنے سے باز نہیں آتے!۔ مجاہد، حسن اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ آیت کا تعلق انھیں لوگوں سے ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ انھوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خریدی ہے یعنی یہ لوگ ایسے اعمال سے باز نہیں آتے جو انھیں صاف طور پر دوزخ کی طرف لیے جاتے ہیں، ذرا ان کی جرأت تو دیکھو!۔ جن لوگوں نے "ما" کو استفہام کے معنی میں لیا ہے ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "دوزخ میں تو کسی کو صبر نہیں ہو سکتا، انھیں کس چیز نے دوزخ کے لیے آمادۂ صبر کر دیا ہے کہ جان بوجھ کر اہلِ دوزخ کے اعمال کیے جا رہے ہیں، اور اللہ کی مغفرت کے بدلہ میں وہ راستہ اختیار کر رکھا ہے جو اس کے عذاب کی طرف انھیں لیے جا رہا ہے"؟۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر پہلی ہے یعنی "انھیں دوزخیوں کے اعمال کرنے کی کیسی جرأت ہوگئی ہے"۔ اہلِ عرب بولتے ہیں "مَآ اَصْبَرَ فُلَانٌ عَلَى اللّٰهِ" یعنی فلاں کو اللہ کے مقابلہ میں کیسی جرأت ہوگئی ہے"۔ تعجب اور حیرت کے اظہار کی وجہ یہ ہے کہ انھیں (یہودیوں کو) سب کچھ ان کی کتابوں کے ذریعہ سے معلوم ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے یہ اعمال انھیں جہنم میں لے جائیں گے، لیکن اس کے باوجود باز نہیں آتے۔[1]

"ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ" (اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا، اور بے شک جو لوگ کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال رہے ہیں وہ بڑے دور دراز کے خلاف میں پڑے ہوئے ہیں)۔ "بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ" کی تفسیر میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات

---

[1] قومی اخلاق میں جب زوال آ جاتا ہے اور ایمان صرف برائے نام باقی رہ جاتا ہے تو عملی زندگی کا یوں ہی جنازہ نکل جاتا ہے۔ یہود اس زمانہ میں اخلاقی زوال کے آخری اسٹیج پر پہنچ چکے تھے اور اپنی عملی زندگی کے گھناؤنے پن کا احساس بھی ان میں باقی نہیں رہا تھا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ایمانی و اخلاقی زوال اگرچہ اس درجہ کا تو ہرگز نہیں، لیکن بہرحال دونوں میں مابہ الاشتراک اتنی بات ضرور ہے کہ ہم بھی یہ جانتے ہوئے کہ گناہ اللہ کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا باعث ہے، اس کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔ یہودی اپنے ایمانی و اخلاقی زوال میں اس سے بہت آگے تھے اور اللہ اور اس کے انبیاء کے بارے میں نہایت سنگین جرائم کا ارتکاب بڑی بے حسی کے ساتھ کر جاتے تھے۔ آیت میں ان کی اسی طرح کی مجرمانہ زندگی کی ایک مثال بیان کی گئی ہے (مترجم)۔

Marfat.com

ابن جریر نے فرمایا کہ "ان کا یہ عمل یعنی حق کو چھپانا اللہ کے احکام کی جان بوجھ کر مخالفت اور اس کے عذاب پر جرأت اس لیے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا" اشارہ اس آیت کی طرف ہے جس میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف طور پر اطلاع دے دی گئی تھی کہ "جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے حق میں برابر ہے، خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردے ہیں اور ان کے لیے عذاب عظیم مقدر ہوچکا ہے" ان لوگوں کے متعلق اللہ کی یہ اطلاع ہے جس کی طرف اشارہ اس آیت میں کیا گیا ہے کہ ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے کے سوا اور ان کا کوئی پیشہ نہیں۔ اور یہی وہ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا، کیونکہ ہم نے انھیں پہلے ہی بتادیا تھا کہ منکروں کی سزا دوزخ ہے، اور ان سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ ان کا بھی انجام دوزخ ہی ہے، "ذٰلِکَ" سے اشارہ اس عذاب کی طرف ہے جو اس سے پہلے کی آیت "اور یہ لوگ کیسی جیوٹ رکھتے ہیں دوزخ کے لیے" میں ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "ان پر یہ عذاب ان کے کفر کی وجہ سے ہے یعنی اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری تھی، لیکن انھوں نے اس کا کفر کیا، اور ان پر عذاب اسی کفر کی وجہ سے ہوگا۔ میرے نزدیک "ذٰلِکَ" سے اشارہ ان تمام ہی امور کی طرف ہے جن کا ذکر "اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ" سے زیر تفسیر آیت تک ہوا ہے اور جن میں یہودی پیشواؤں کی بدعملیوں اور ان پر اللہ کے عذاب کا ذکر ہے، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حق کو چھپانا، دنیا کی معمولی پونجی کے بدلہ میں میری کتاب میں تحریف کرنا، میرا ان سے قیامت کے دن کلام نہ کرنا اور ان کے لیے دردناک عذاب تیار رکھنا، یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ میں نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا اور اس کے باوجود انھوں نے اس کا کفر کیا اور اس میں اختلاف کیا۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ" سے بھی مراد یہود و نصاریٰ ہی ہیں، کہ انھوں نے کتاب اللہ میں اختلاف کیا، چنانچہ یہود نے ان آیات اور واقعات کا انکار کیا جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم اور ان کی والدہ کے بارے میں پہلے ہی بیان کردیئے تھے، نصاریٰ نے بھی اس کے بعض حصے کی تصدیق کی اور باقی کے وہ بھی منکر ہیں، اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی صداقت کے یہ سب منکر ہیں۔ اسی کے متعلق اس آیت میں بیان ہے کہ اے محمد، یہ لوگ جو اس کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال رہے ہیں جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے، تو یہ حق کے معاملہ میں دور دراز کے خلاف میں پڑے ہوئے ہیں اور ہدایت سے بہت دور ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

کچھ سارا کمال اِسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ

لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (سب) کتب سماویہ پر

Marfat.com

وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو

وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى

اور (بے خرچ) مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ

الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ

بھی ادا کرتا ہو اور جو شخص (ان عقائد و اعمال کیساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنیوالے ہوں جب عہد کرلیں اور وہ لوگ

فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ

مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں

طاعت کیا ہے؟

"لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ" (طاعت یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا کرو، بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے) آیت کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ "تنہا نماز طاعت نہیں ہے، بلکہ وہ سب چیزیں طاعت ہیں جن کی تفصیل میں اس آیت میں بیان کروں گا"۔ گویا اس قول میں "اَنْ تُوَلُّوْا قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ" سے مراد نماز ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ طاعت یہ نہیں ہے کہ صرف نماز پڑھ لیا کرو اور دوسرے نیک اعمال کو چھوڑ دو" یہ آیت ہجرت کے بعد نازل ہوئی، جب فرائض اور حدود بھی نازل ہو گئے تھے، اس لیے ان پر بھی عمل کا حکم دیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "طاعت مغرب یا مشرق کی طرف رخ کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ اللہ کی طاعت دلوں میں نقش ہو جائے"۔ ضحاک سے بھی یہی تفسیر روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ ہیں، یہودی مغرب کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف، انھیں کے بارے میں اللہ نے یہ آیت نازل کی کہ طاعت کسی خاص سمت کی طرف رخ کرنے میں نہیں بلکہ ان امور میں ہے جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمہا اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے "بر" (طاعت) کے بارہ میں سوال کیا تھا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ فرائض کے نازل ہونے سے پہلے صرف اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت نجات کے لیے کافی تھی، پھر یہ آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ نجات کے لیے وہ اُمور ضروری ہیں جن کا ذکر آیت میں ہے۔ یہودی مغرب کی سمت رخ کرکے عبادت

Marfat.com

کرتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی سمت کی تقدیس کے قائل تھے۔ میرے نزدیک یہی آخری قول زیادہ مناسب ہے، کیونکہ پہلے ہی سے یہود کا تذکرہ چلا آرہا ہے، اس لیے یہاں بھی خطاب انھیں سے مراد لینا مناسب ہے، جبکہ ان کے معتقدات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ اے یہود و نصاریٰ! طاعت مشرق یا مغرب کی طرف چہرہ کرنے میں نہیں ہے، بلکہ طاعت نام ہے ایمان صحیح اور عمل صالح کا۔ "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ" بلکہ طاعت اس شخص کی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے۔ آیت میں "اَلْبِرَّ" (طاعت) کے لیے "مَنْ" کا استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ "مَنْ" انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے، معنیٰ یہ ہوگا کہ "نیکی وہ شخص ہے"، لیکن عرب میں اس طرح کے کلام کا عام رواج تھا، مثلاً بولتے "اَلْجُوْدُ حَاتِمٌ" (سخاوت حاتم ہے)، حالانکہ مراد یہ ہوتی کہ "سخاوت تو حاتم کی سخاوت ہے" (اَلْجُوْدُ جُوْدُ حَاتِمٍ) وغیرہ۔ یہی صورت آیت میں بھی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "اَلْبِرَّ" سے مراد "اَلْبَارُّ" (طاعت کرنے والا) ہو۔ پھر تو کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

"وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ" (اور مال کی محبت کے باوجود اسے خرچ کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں پر اور گردنوں (غلاموں) کے آزاد کرنے میں)۔ "حُبِّهٖ" کی ضمیر سے مراد مال ہے، یعنی مال کی محبت اور اسے اپنے پاس جمع رکھنے کی خواہش ہو، اس کے باوجود اسے خرچ کرے، یہ سمجھ کر کہ اللہ کا حکم یہی ہے اور اس کی رضا اور خوشنودی کے حاصل کرنے کا ذریعہ یہی ہے۔ یہ تفسیر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ، میرے پاس ستر مثقال سونا ہے؟ آں حضور ؐ نے فرمایا کہ اسے قرابت داروں کو دیدو۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی شخص نے پوچھا کہ کیا آدمی کے مال میں زکات کے سوا اور بھی کوئی حق ہے، جہاں مال خرچ کیا جانا چاہیے، تو آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت کی یعنی آیت میں زکات کے علاوہ نفلی صدقات ہی کی نشان دہی کی گئی ہے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ مال میں زکات کے علاوہ بھی حق ہے، آں حضور ؐ نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مال کو، اس سے محبت کے باوجود اپنے قرابت داروں پر خرچ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کم آمدنی کے باوجود آدمی کا اپنے قرابتدار پر خرچ کرنا۔ "اَلْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ" کی تفسیر پہلے گذر چکی۔ "اِبْنُ السَّبِيْلِ" سے مراد مسافر ہے، لیکن کس طرح کا مسافر؟ اس کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد "مہمان" ہے، آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی کہ جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ بھلی بات زبان سے نکالے ورنہ چپ رہے۔ پھر آپ نے کہا کہ مشہور ہے کہ مہمانی کا حق تین دن تک ہے، اس کے بعد صدقہ ہے۔ ابوجعفر اور مجاہد رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ مراد "عام مسافر" ہے، یعنی سفر کے دوران میں کسی بستی وغیرہ سے گذرنے والا۔ "اِبْنُ السَّبِيْلِ" سفر کرنے والے کو اس لیے کہتے ہیں کہ سفر کے دوران میں وہ راستے سے نہیں ہٹتا۔ "ابن" کے ساتھ اس طرح کا استعمال عرب میں عام اور مروج تھا، پانی کے پرندے کو "اِبْنُ الطَّيْرِ" کہتے تھے۔ "اَلسَّآئِلِيْنَ" سے مراد مانگنے والے ہیں۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے۔ "فِي الرِّقَابِ" یعنی گردن آزاد کرانے میں، مراد غلاموں کی آزادی ہے۔ یہ تمام مواقع ہیں جہاں مال کو محبت کے باوجود خرچ کرنا طاعت ہے۔

"وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا" (اور نماز کی پابندی کرے اور

Marfat.com

زکات ادا کرے اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وہ وعدہ کر چکے ہوں)۔ "اَقَامَ الصَّلٰوۃَ"، یعنی نماز کے حدود اور اس کے آداب کی رعایت کے ساتھ اس کی پابندی کرے۔ "وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ"، یعنی اللہ کے فریضہ کے مطابق زکات ادا کرے۔ "وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا"، کا مطلب یہ ہے کہ "جو معاہدہ کے بعد اللہ کے نام پر کیے ہوئے عہد کو نہیں توڑتے، بلکہ اسے پورا کرتے ہیں"۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے نام پر کسی سے معاہدہ کر کے توڑ دے گا اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لیں گے اور جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر معاہدہ کر کے اسے توڑے گا، آں حضور قیامت کے دن اس پر دعوے دار ہوں گے۔

"وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ"، صبر کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اور تنگی میں اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے"، یعنی اگرچہ خواہش ان چیزوں سے دور رہنے کی ہوتی ہے، کہ ہر شخص کے لیے یہ امور ناگوار ہیں، لیکن وہ ان حالات میں بھی اللہ کی اطاعت پر جمے رہنے والے ہوں اور ان سے گھبرانے والے نہ ہوں۔ "اَلْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ"، کے کئی معنی مفسرین سے نقل ہوئے ہیں۔ سدی، قتادہ ضحاک اور ابن جریج رحمہم اللہ سے نقل ہے کہ "اَلْبَاْسَآءُ"، فقر اور تنگی کے معنی میں ہے، اور "اَلضَّرَّآءُ"، بیماری کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں لفظ اسماء افعال ہیں۔ "اَلصّٰبِرِیْنَ"، کو نصب مدح کی وجہ سے ہے، جب کسی کی صفات کا بیان طویل ہو جاتا تو اہل عرب درمیان میں کوئی لفظ مدح یا ذم کے لیے ایسا لاتے جو قاعدہ کی رعایت کے بغیر منصوب یا مرفوع ہوتا یہی صورت یہاں بھی ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کا عطف اس سے پہلے کی آیت کے "اَلسَّآئِلِیْنَ"، پر ہے اور اسی وجہ سے اسے نصب ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ "وَحِیْنَ الْبَاْسِ"، یعنی "گھمسان کی لڑائی کے وقت"، بھی وہ صبر کرنے والے ہوں۔ یہ قول عبداللہ رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، ربیع اور ضحاک رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

"اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ"، یعنی یہی لوگ ہیں جو سچے اترے اور یہی لوگ متقی بھی ہیں، مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور جن کی صفات اوپر کی آیات میں گذریں۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے اترے اور زبان سے جو کچھ کہا اسے عمل سے سچا کر دکھایا، اس کے برعکس وہ لوگ جن کے یہاں ساری اہمیت مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو ہے، اور جو حق اور اللہ کی آیات کو چھپاتے ہیں اور اس کے رسول کو جھٹلاتے ہیں وہ اس معیار پر کسی طرح پورے نہیں اترتے، بلکہ ان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ "وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ" یعنی یہی ہیں جو اللہ کے عقاب سے ڈرے اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کیا۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "یہی وہ لوگ ہیں جو سچے اترے، یعنی ایمان کا جو کلمہ انھوں نے اپنی زبان سے ادا کیا تھا اسے عمل سے ثابت کر دکھایا"۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "یہ ایمان کا کلمہ ہے اور اس کی حقیقت عمل ہے، اگر اس کلمہ کے ساتھ عمل نہ ہو تو پھر کوئی فائدہ نہیں ہوگا"۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ

اے ایمان والو! تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے مقتولین (بقتل عمد) کے بارہ میں

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؕ فَمَنْ عُفِیَ

آزاد آدمی، آزاد آدمی کے عوض میں اور غلام، غلام کے عوض میں اور عورت، عورت کے عوض میں، ہاں جس کو اسکے فریق کی

Marfat.com

لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ

طرف سے کچھ معافی ہو جاوے (مگر پوری معافی نہ ہو) تو (مدعی کے ذمہ) معقول طور پر (خونبہا کا) مطالبہ کرنا اور (قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ اس کے پاس

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى

پہونچادینا۔ یہ (قانون دیت وعفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا) میں تخفیف اور (شاہانہ) ترحم ہے پھر جو شخص اس کے بعد

بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ

تعدی کا مرتکب ہو تو اس شخص کو بڑا دردناک عذاب ہوگا اور فہیم لوگو (اس قانون) قصاص میں تمہاری

يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

جانوں کا بڑا بچاؤ ہے ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانون امن کی خلاف ورزی کرنے سے) پرہیز رکھوگے۔

قصاص اور اس سے متعلق احکام

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى" آیت میں "كُتِبَ" کے معنیٰ "فُرِضَ" ہیں، یعنی تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔ "قصاص" (بدلہ) فرض کیا گیا ہے، لیکن مقتول کے ولی و وارث کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے، یعنی اگر وہ چاہے تو معاف بھی کر سکتا ہے، مال کی ایک متعینہ مقدار پر، جسے شریعت میں "دِیَت" کہتے، قاتل سے مصالحت بھی کر سکتا ہے، گویا اس کے لیئے قصاص مباح اور جائز ہوا۔ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ "اے ایمان والو تم پر مقتول کے باب میں قصاص فرض کیا گیا ہے، آزاد کے بدلہ میں آزاد، غلام کے بدلہ میں غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت" یہاں قصاص کے فرض کیئے جانے کا مفہوم یہ ہے کہ آزاد اگر کسی آزاد شخص کو قتل کردے تو قاتل کا خون مقتول کے خون کے برابر سمجھا جائے گا اور بدلہ صرف قاتل سے لیا جائے گا، قاتل کے سوا کسی بھی غیر متعلق شخص سے بدلہ نہیں لیا جائیگا، کہ بے گناہ کو مجرم بنا لینا حرام ہے۔ قصاص اسی لیئے فرض کیا گیا ہے اور اس کے فرض ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ قاتل کے سوا کسی بھی دوسرے شخص سے بدلہ نہ لیا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ "قصاص" بھی ہم پر نماز روزہ کی طرح فرض ہے، کہ اسے چھوڑنا جائز ہی نہ ہو۔ اگر یہی مطلب ہوتا تو اس کے بعد کی آیت "ہاں جسے اس کے فریق مقابل کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے"، کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم نے آیت میں قصاص کے فرض کیئے جانے کی وضاحت کی کہ مقصود صرف قاتل ہی سے قصاص لیئے جانے کی تحدید ہے، اس لیئے آیت سے کوئی یہ مفہوم بھی نہ نکالے کہ آزاد صرف آزاد ہی کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا، کیونکہ آیت میں اس مسئلہ کو نہیں چھیڑا گیا ہے، یہ حکم دوسری آیت میں آیا ہے۔ "مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا" (جو کوئی ناحق قتل کیا جائے سو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دے دیا ہے) اسی طرح آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ یہ حدیث ثابت ہے کہ "ہر مسلمان کا خون دوسرے مسلمان کے خون کے برابر ہے"۔

آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ایک ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی جن کے کسی فرد کو

Marfat.com

اگر دوسری قوم کا غلام قتل کر دیتا تو وہ قاتل کو قتل کرنے کے بجائے قوم کے سردار کے قتل کا مطالبہ کرتے اور اسے ہی قتل کرکے چھوڑتے کیونکہ غلام کو اپنے آزاد کے بدلہ میں قتل کرنے میں وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی عورت ان کی قوم کے کسی مرد کو قتل کر دیتی تو اس عورت کو بدلہ میں قتل نہیں کرتے، بلکہ اس عورت کے قبیلہ کے مرد کو قتل کرتے۔ عرب کے قبائل اپنی جاہلی شرف و عزت کے غرور میں اس طرح کے اقدامات کرتے تھے۔ آیت میں اس سے روکا گیا ہے کہ یہ شیطانی عمل ہے کہ قتل کا بدلہ کسی بے گناہ سے لیا جائے، قاتل جو بھی ہو صرف وہی مجرم ہے۔ یہ قول قتادہ، شعبی، عامر، مجاہد اور عطاء رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو فریقوں میں، جن میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا کافر جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا، جنگ ہوئی اور دونوں طرف کے مرد اور عورتیں قتل کی گئیں۔ آں حضور نے خونبہا کے اصول کے مطابق ان میں صلح کرائی۔ صورت اس کی یہ کی کہ ہر فریق کی عورتوں کا تاوان دوسرے فریق کی عورتوں کے تاوان کے بدلہ میں رکھا، مردوں کا تاوان دوسرے فریق کے مردوں کے تاوان کے بدلہ میں اور غلاموں کا تاوان دوسرے فریق کے غلاموں کے تاوان کے بدلہ میں۔ آیت میں اسی صورت کا بیان ہے۔ سدی اور شعبی رحمہما اللہ سے یہ روایت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آیت آزاد، غلام اور مرد اور عورت کے خون بہا (مالی تاوان) کی صورت بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی یعنی قتل عمد کی صورت میں اگر مقتول کا قاتل سے قصاص لیا گیا اور مقتول قاتل سے کم درجہ کا ہے تو قاتل کے درجہ کی قیمت کے پیشِ نظر مقتول کے ورثاء کو اسی کے مطابق تاوان دینا پڑے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ اگر کسی آزاد نے مثال کے طور پر کسی غلام کو قتل کر دیا تو اس سے اس کا بدلہ لیا جائے گا، لیکن اگر غلام کے مالک آزاد قاتل کو اس کے بدلہ میں قتل کرنے کا مطالبہ کریں تو انھیں اس کا حق ہے، البتہ اس صورت میں انھیں مالی تاوان بھی دینا پڑے گا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ قتلِ عمد کی صورت میں خون بہا (دیت) کا جو فرق غلام اور آزاد میں ہے، اس کے پیشِ نظر غلام کے بدلہ میں اگر آزاد کو قتل کیا گیا تو اتنا مالی تاوان غلام کے وارثوں کو قاتل کے وارثوں کو دینا ہوگا جو آزاد کے قتلِ عمد کی صورت میں ہوتا ہے، البتہ غلام کی قیمت اس میں سے کاٹ لی جائے گی۔ اسی طرح عورت اور مرد کا فرق کیا جائے گا، اگر کسی مقتول عورت کے بدلہ میں قاتل مرد کو مقتولہ کے وارثوں نے قتل کرنے کا مطالبہ کیا تو مرد کے قتل کی صورت میں جو دیت واجب ہوتی، اس کا نصف انھیں مرد کے وارثوں کو دینا ہوگا۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ آیت عرب کے ان قبائل کے بارے میں نازل ہوئی جو مرد کے بدلہ میں مرد ہی کو قتل کرتے تھے، اگر عورت قتل کی جاتی اور قاتل مرد ہوتا تو اسے بدلے میں قتل نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام جانیں برابر ہیں اور خون اور قصاص کے معاملہ میں کسی جنس کو دوسری جنس پر فوقیت نہیں ہے۔ اس حکم کو اور زیادہ صاف اس آیت میں کر دیا گیا ہے کہ "اور ہم نے ان پر فرض کیا تھا کہ جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا ناک اور کان کا کان اور دانت کا دانت اور زخموں میں قصاص ہے"۔ آیت میں بلا کسی تفریق کے قصاص کے معاملہ میں سب کو ایک سطح پر رکھا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی قول نقل ہوا ہے۔

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں اگرچہ اقوال مختلف ہیں، لیکن بہرحال قبول وہی قول کیا جائے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ آں حضور کی احادیث میں، جن کی نقل و روایت کی حیثیت بہت مضبوط اور صاف ہے، یہ مضمون واضح طور

Marfat.com

پر موجود ہے کہ آزاد عورت کا قصاص آزاد مرد سے لیا جائے گا، اور اس میں کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی جائے گی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی موجودگی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول یہ قول قبول نہیں ہوگا کہ مرد سے عورت کا قصاص لینے میں، یا آزاد سے غلام کا قصاص لینے میں تفریق کی جائے گی اور اگر اس طرح کی صورتوں میں مقتول کے وارثین جان کا بدلہ جان سے لینے پر مصر ہیں تو انھیں مالی تاوان دینا پڑے گا۔ یہ قول اہل اسلام کے اجماع کے خلاف ہے اور اس لیے ہرگز قابل قبول نہیں۔ اس سے بھی قطع نظر کسی شخص کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ اپنے جسم کا کوئی بھی عضو مالی معاوضہ لے کر ضائع کرے، ایسی کوئی بھی صورت حرام ہے، ظاہر ہے کہ مالی معاوضہ لے کر جان ضائع کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اسی طرح کسی بھی شخص پہ یہ حرام ہے کہ مالی معاوضہ دے کر دوسرے شخص کے بدن کا کوئی حصہ ضائع کرے۔ اس لیے جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے تو اسے کلی طور پر قصاص ہی کہا جائے گا۔ آیت میں بھی "غلام کے بدلہ میں غلام، آزاد کے بدلہ میں آزاد، عورت کے بدلہ میں عورت" سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ ایک جنس کو اس کی مخالف جنس کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا، اور یہ اب تک کی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے، اس لیے اس کی تفسیر میں دو ہی قول قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مقصود یہ ہے کہ قصاص صرف قاتل ہی سے لیا جائے، قاتل کے سوا دوسرے بے گناہ افراد کو اس میں نہ گھسیٹا جائے یعنی ایسا نہ کیا جائے کہ قتل تو کیا عورت نے اور قصاص مرد سے لیا جائے، یا قتل کیا ہو غلام نے اور بدلہ لیا جائے آزاد سے، جیسا کہ عرب کے بعض قبائل جاہلی نخوت کی بنا پر ایسا کرتے تھے۔

دوسرا قول یہ کہ آیت چند قبیلوں کے معاملہ کے سلسلے میں نازل ہوئی اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مقتولین کا ایک دوسرے کو مالی معاوضہ دلوایا تھا، جیسا کہ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول روایت میں اس کی تفصیل گذری۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے، بندوں کے حقوق میں قصاص اور بدلہ لینا واجب و فرض نہیں ہے، بلکہ معاف بھی کیا جا سکتا ہے، اسی طرح خونبہا بھی لیا جا سکتا ہے، اس لیے آیت کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اہل حقوق پر مقتول کے باب میں قصاص لینا فرض کیا گیا ہے، اگر فرض مان لیا جائے پھر تو انھیں معاف کرنے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا، حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مقتول کے وارث معاف بھی کر سکتے ہیں ہم اس کا مفہوم بیان کر چکے ہیں۔ "کُتِبَ" کے اصلی معنی تو لکھنا ہیں، لیکن کلام عرب میں فرض ولازم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اشعار میں اس معنی میں اس لفظ کا استعمال بکثرت ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ معنی بھی کتابت ہی سے ماخوذ ہے، جو لکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ "لوح محفوظ میں تمہارے لیے مقتول کے باب میں قصاص لکھ دیا گیا ہے، کہ بدلہ میں صرف قاتل ہی قتل کیا جائے، کوئی دوسرا نہ قتل کیا جائے" "اَلْقِصَاصُ"، "قَاصَصْتُ فُلَانًا" سے ماخوذ ہے یعنی میں نے فلاں سے اپنے حق کا بدلہ لے لیا جو اس نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ اس میں عمل یکساں ہوتا ہے، اگرچہ ایک طرف سے ظلماً وہ عمل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے حق وانصاف ہے۔ قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کرنے میں بھی یہی صورت ہوتی ہے "قَتْلٰی"، "قَتِیْلٌ" کی جمع ہے، یعنی مقتول۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو، مقتول کا قصاص یہ ہے کہ اس کے بدلہ میں قاتل کو قتل کیا جائے، خواہ وہ عورت ہو، غلام ہو یا آزاد ہو۔

مصالحت کے بعد	"فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ" مفسرین سے اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا مفہوم یہ نقل ہے

Marfat.com

کہ "پھر جس کسی کو قتل عمد (قصد وارادہ کے ساتھ قتل) میں اس کے بھائی یعنی مقتول کے فریق، کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے تو معاف کرنے والے کی طرف سے دیت (خونبہا، مالی تاوان) کے مطالبہ میں نرمی اور معقولیت ملحوظ رہنی چاہیئے، اور جسے معاف کیا گیا ہے، یعنی قاتل، اس کی طرف سے خونبہا کی ادائیگی مناسب طریقہ پر اور خوبی کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ قتل عمد میں عدالت کا فیصلہ تو قصاص ہی ہوگا، یعنی قاتل کو اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے، لیکن مقتول کے ورثا اور قاتل میں صلح ہو جائے اور ورثاء مقتول قاتل سے خونبہا لے کر اسے معاف کرنے پر تیار ہو جائیں تو عدالت بھی قصاص کا فیصلہ نہیں کرے گی کیونکہ قتل اسلام کی نظر میں قابل راضی نامہ جرم ہے۔ آیت میں "عُفِیَ" کا یہی مطلب ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ مقتول کے ورثا، خونبہا کے مطالبہ میں نرم خوئی اور معقولیت کا مظاہرہ کریں اور مزید شر و فساد سے پرہیز کریں۔ دوسری طرف یہی ہدایت قاتل کو دی جا رہی ہے کہ وہ خونبہا کی ادائیگی ٹھیک طریقہ پر کر دے، غیر مناسب روش نہ اختیار کرے۔ مجاہد، حسن، شعبی، قتادہ، ربیع، ابن جریج اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہی قول نقل ہوا ہے۔ جن حضرات نے "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ" کا شانِ نزول یہ بتایا تھا کہ دو فریقوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور انھیں یہ حکم ہوا تھا کہ ہر فریق اپنے فریقِ مخالف کے مقتولین کی دِیَت ادا کرے، وہ اس آیت کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ "جس فریق کی دیت اس کے بھائی دوسرے فریق پر زیادہ نکل آئے تو انھیں مطالبہ میں نرمی اختیار کرنی چاہیئے، اور جن پر دیت باقی رہ گئی ہے انھیں ادائیگی ٹھیک طرح کر دینی چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ ان حضرات نے "عَفْو" (جس سے عُفِیَ نکلا ہے) کا معنی کثرت لیا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل ہے۔ میرے نزدیک صحیح قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، جو سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ "فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ" کا مطلب یہ ہے کہ قصاص کی معافی اور صلح کے بعد اللہ نے جو خونبہا متعین کر دیا ہے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جائے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خونبہا میں ایک اونٹ بھی زیادہ دینا یا زیادتی کا مطالبہ کرنا جاہلیت کے کاموں میں سے ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے "حسن ادائیگی" کا یہ مفہوم ہے کہ جو کچھ خونبہا کے طور پر اس پر واجب ہے وہ ٹھیک ادا کرے، کسی قسم کی حق تلفی یا ٹال مٹول نہ کرے۔

"ذَالِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ" یعنی یہ جو تمہارے رب نے قتل عمد کی صورت میں قصاص کے علاوہ خونبہا کی بھی صورت تمہارے لیئے پیدا کر دی ہے، "یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیئے تخفیف اور مہربانی ہے"۔ پچھلی امتوں میں یہ صورت نہیں تھی اور ان پر قتل کے بدلہ میں خونبہا لینا حرام تھا، لیکن میں نے اس امت کے لیئے اسے جائز کر دیا ہے اور یہ محض میری مہربانی اور میری طرف سے تمہارے لیئے رعایت و تخفیف ہے۔ یہ قول ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ اور ربیع سے منقول ہے۔

"فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَالِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ" "پس جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے گا اس کے لیئے دردناک عذاب ہے"، یعنی قتلِ عمد کی صورت میں جو شخص خونبہا وصول کرنے کے بعد پھر ظلم کرے اور قاتل کو قتل کر دے تو اس کے اس فعل پر، جو میں نے اس کے لیئے حرام کیا ہے، اسے دردناک عذاب ملے گا۔ مجاہد، قتادہ، حسن، عکرمہ، سُدّی، ابن زید رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل ہے۔ قتادہ نے ایک حدیث کی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص خونبہا لینے کے بعد قاتل کو قتل کرے گا میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ "فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ" کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ ضحاک، سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ "خونبہا لینے کے بعد جس نے قاتل کو قتل کیا

Marfat.com

اس کی سزا قتل ہے

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں "عذاب" سے مراد وہ سزا ہے جو ایسے شخص کے لیے حاکم تجویز کرے گا، یعنی ایسے شخص کی سزا حاکم کی ثواب دید پر موقوف ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہ صورت نقل ہوئی ہے کہ ایسے شخص سے وہ خونبہا لے لیا جائیگا جو اس نے قاتل سے وصول کیا تھا، اس کے بعد ان کا معاملہ برابر ہوجائے گا۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر پہلی ہے، یعنی خونبہا لینے کے بعد پھر اگر قاتل کو قتل کر دیا تو اسی دنیا میں اسے دردناک سزا دی جائے گی، اور وہ قتل ہے۔ آیت سے بھی یہی ظاہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا قول علماء امت کے اجماع کیخلاف ہے

"وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ"، "تمہارے لیے، اے اہل عقل وفہم میرے فرض کیے ہوئے قانونِ قصاص میں زندگی ہے"، یعنی اگر تم نے اس پر عمل کیا تو پھر کوئی کسی کو قتل کرنے کی جرأت نہیں کرے گا، اور اس طرح ناحق قتل سے تمہاری حفاظت ہوجائے گی اور تمہاری زندگی امن سے گذرے گی۔ اس میں تمہاری دنیا کی بھی صلاح ہے اور دین کی بھی۔ مجاہد، قتادہ، ربیع، ابن زید اور ابو صالح رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسری تفسیر اس آیت کی عرب جاہلیت کے اس دستور کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے کہ قاتل کو چھوڑ کر بے گناہوں کو اس جرم میں قتل کرتے تھے، قاتل اگر عورت ہے تو اس کے قبیلہ کے کسی مرد کو قتل کرنا باعث شرف وعزت سمجھتے، اگر قاتل غلام ہے تو اسے قتل کرنے میں انھیں اپنی توہین نظر آتی، وہ اس کے بجائے غلام کے مالک کو قتل کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تفسیر یہ ہے کہ "اس قانون میں کہ صرف قاتل سے قصاص لیا جاسکتا ہے تمہارے لیے زندگی ہے"، کیونکہ اصل مجرم ہی پکڑا جائے گا، دوسرے افراد جو بے گناہ ہیں، ان کی زندگی محفوظ رہے گی۔ یہ قول سُدّی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔ "يَا أُولِي الْأَلْبَابِ"، یعنی اے اہل عقل وفہم۔ "اَلْبَاب" "لُبٌّ" کی جمع ہے، یعنی عقل۔ یہاں خطاب خاص اہل فہم طبقہ سے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و نواہی اور اس کے بنائے ہوئے قانون کی گہرائیوں کو یہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، اور یہی لوگ اس کی آیات اور اس کی نشانیوں میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" "تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ"، یعنی ناحق قتل کرنے سے باز آجاؤ، اور اس طرح تمہاری بھی جان محفوظ رہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ صلے

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝

تو والدین اور اقارب کے لیے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک تلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جاوے (اس کا نام وصیت ہے) جن کو خدا کا خوف ہے

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ

اُنکے ذمہ یہ ضروری ہے۔ پھر جو شخص اُس (وصیت) کے سن لینے کے بعد اس کو تبدیل کر دے گا تو اس کا گناہ ان ہی لوگوں کو ہوگا جو اسکو تبدیل کرینگے

إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ ط فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا

اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں ہاں جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی بے عنوانی کی یا کسی جرم کے ارتکاب کی

Marfat.com

فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع ۲۲

تحقیق ہوئی ہو۔ پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ واقعی اللہ تعالیٰ تو د خود گناہوں کے معاف فرمانے والے ہیں رحم کرنیوالے ہیں

وصیت کے احکام

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ" یہاں "كُتِبَ" فرض کے معنی میں ہے، یعنی اے مسلمانو، تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ مال بھی چھوڑ رہا ہو تو والدین اور عزیزوں کے حق میں معروف کے مطابق وصیت کرے، آیت میں "خَيْرًا" سے مراد مال ہے، "اَلْاَقْرَبِيْنَ" یعنی وہ عزیز و اقارب جو ورثاء میں سے نہ ہوں۔ "بِالْمَعْرُوْفِ" یعنی یہ وصیت ان حدود میں رہتے ہوئے ہونی چاہیے جہاں تک اللہ نے اجازت دی ہے کہ اصل مال کے تہائی حصہ سے زیادہ میں وصیت نہ کرے، اسی طرح وصیت کرنے والے کا مقصد اس سے ورثاء پر ظلم اور ان کی حق تلفی بھی نہ ہونا چاہیے۔ "حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ" یعنی جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور اس کے اطاعت گذار ہیں ان پر یہ لازم ہے۔ اس آیت کی رو سے ہر صاحب مال پر موت سے پہلے اپنے والدین اور ایسے عزیزوں کے لیے وصیت فرض ہے جنہیں اس کے مال میں وراثت نہ ملے۔ اگر اس نے وصیت نہیں کی تو ایک فرض کا چھوڑنے والا سمجھا جائیگا، کیونکہ وصیت کے لیے "كُتِبَ عَلَيْكُمْ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی تم پر فرض کی گئی ہے۔ اس کے بعد روزے کے لیے بھی بعینہ یہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ قدرت اور صحت کے باوجود اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھتا تو وہ اللہ کا ایک فریضہ چھوڑتا ہے۔ یہی صورت مال کی موجودگی میں مرتے وقت والدین اور عزیزوں کے لیے وصیت میں بھی ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اس آیت کو اس کے بعد نازل ہونے والی اس آیت سے منسوخ اور ناقابل عمل سمجھتی جس میں وراثت کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ زیر تفسیر آیت وراثت کے حکم سے بہت پہلے نازل ہوئی تھی اور ابتداء میں صرف وصیت ہی کا حکم تھا، لیکن جب وراثت کے احکام نازل ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی مرنے والے کے مال میں اس کے عزیز و اقارب کے حصوں کی تفصیلات بیان کر دیں تو پھر یہ آیت منسوخ ہو گئی، یعنی صاحب مال پر مرنے سے پہلے وصیت کرنا فرض نہیں رہا، لیکن بہرحال اہل علم ہی کی ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ یہ آیت کسی بھی دوسری آیت سے منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور اس پر تمام دوسری آیات کی طرح پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے انھیں اس کی دلیل بھی دینی چاہیے۔ اصل میں اس آیت پر آیت میراث کے ساتھ عمل ہو سکتا ہے۔ دونوں کے مضامین ایک دوسرے کے کسی درجہ میں بھی خلاف نہیں کہ اس آیت کے احکام پر عمل چھوڑنے کے مطالبہ کو معقول کہا جا سکے۔

آیت کی جو تفسیر ہم نے بیان کی وہ متقدمین اور متاخرین اہل علم کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صاحب مال شخص نے مرنے سے پہلے اگر اپنے عزیزوں کے لیے وصیت نہیں کی تو اس نے اپنے عمل کا خاتمہ گناہ سے کیا۔ مسروق، مغیرہ شعبی، عبداللہ بن معمر اور ابو مجلز کے اقوال سے ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، اہل علم کا اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کا کوئی حصہ منسوخ نہیں کیا، بلکہ سب پر عمل ضروری ہے، اس آیت کی رو سے صاحب مال مرنے والے کے لیے اپنے والد اور والدہ

Marfat.com

کے لیے وصیت ضروری ہے، اسی طرح اعزہ واقارب کے لیے بھی وصیت ضروری ہے۔ آیت سے مراد تمام اعزہ نہیں ہیں، بلکہ صرف وہ ہیں جو وراثت کے حق دار نہیں ہیں۔ اس کی تائید میں ہم نے بہت سے اہل علم کا قول نقل کیا ہے۔ بعض دوسرے اہل علم کے قول سے بھی ہمارے اختیار کردہ مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ جابر بن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے قرابت داروں کو چھوڑ کر اپنے تہائی مال میں سے دوسروں کو وصیت کرتا ہے، حالانکہ اس کے محتاج قرابت دار موجود ہیں تو جتنے مال کی اس نے وصیت کی ہے اس کا ایک تہائی اس کے قرابت داروں کو دے دیا جائے گا اور دو تہائی انھیں دیا جائے گا جن کے لیے مرنے والے نے وصیت کی تھی۔ حسن، جابر بن زید اور عبدالملک بن یعلیٰ کی ایک روایت میں اس کے برعکس یہ ہے کہ دو تہائی قرابت داروں کو اور ایک تہائی انھیں جن کے لیے وصیت کی گئی ہے دیا جائے گا۔ طاؤس کی روایت میں ہے کہ سب مال لے کر عزیزوں کو دے دیا جائے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ ہے، یہ آیت ابتدا میں نازل ہوئی تھی اور وصیت کو فرض قرار دیا گیا تھا، کچھ دنوں تک اس پر عمل بھی رہا، لیکن پھر میراث کی تفصیلات جب قرآن مجید میں نازل ہو گئیں تو اس سے اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا، اس آیت کی رُو سے والدین اور عزیزوں کے لیے صاحب مال مرنے والے پر وصیت ضروری تھی، کیونکہ میراث کا کوئی حکم اب تک نازل نہیں ہوا تھا، لیکن میراث خود اللہ تعالیٰ نے متعین کر دی تو اب عزیز واقارب کے لیے وصیت فرض نہیں رہی، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، طاؤس، حسن، ربیع، علاء بن زیاد، ایاس بن معاویہ اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی روایت ہے کہ یہ آیت سورۂ نساء کی میراث کی اس آیت سے منسوخ ہے جس میں والدین اور دوسرے عزیز واقارب کی میراث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس لیے والدین اور دوسرے ورثاء کے حق میں مرنے والا وصیت نہ کرے، البتہ جو رشتہ دار اس کے مال کی وراثت میں حصہ دار نہیں ہو سکتے ان کے لیے وصیت کرے، کیونکہ ان کے لیے وصیت کا حکم آیت میراث سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا تمام حکم منسوخ ہو گیا ہے، کیونکہ یہ وراثت اور فرائض کی تفصیلات سے پہلے حکم تھا، اللہ نے جب خود میراث کا حکم نازل کر دیا تو اب کسی پر کسی کے لیے وصیت ضروری نہیں، خواہ وہ قریب کا رشتہ دار ہو یا دور کا۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما، حسن بصری، قاضی شریح، قتادہ، مجاہد، سدی اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے بھی روایت ہے کہ وصیت کا حکم میراث کی آیت سے منسوخ ہو گیا ہے۔ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور آپؐ نے کوئی وصیت نہیں کی، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور آپؓ نے انتقال سے پہلے وصیت کی، اس لیے جس کا جی چاہے وصیت کرے اور جس کا جی چاہے نہ کرے۔ وصیت فرض نہیں ہے۔

آیت میں ”خَیْرًا“ سے مراد مال ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، سدّی، ربیع، ضحاک، عطاء بن ابی رباح سے یہی منقول ہے۔ مال جس پر وصیت کے وجوب کا حکم ہے، اس کی مقدار بعض حضرات نے ایک ہزار درہم یا اس سے زیادہ بتائی ہے۔ علی بن ابی طالب اور عائشہ رضی اللہ عنہا اور قتادہ اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے یہ مقدار نقل ہوئی ہے۔ لیکن زہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مال کم ہو یا زیادہ تمام صورتوں میں وصیت واجب ہے۔ میرے نزدیک زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ مناسب ہے، کیونکہ مال کم ہو یا زیادہ، خیر کا اطلاق تو سب پر ہو سکتا ہے۔

”فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ“ پھر جو کوئی وصیت کرنے والے کی

Marfat.com

وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل دے تو اس بدلنے کا گناہ انھیں لوگوں پر ہوگا جنھوں نے وصیت کو بدلا ہے۔ "بَدَّلَهُ" کی ضمیر "ایصاء" کی طرف لوٹتی ہے، جو اگرچہ آیت میں لفظوں میں مذکور نہیں ہے، لیکن کلام سے سمجھا جاتا ہے۔ "سَمِعَهُ" کی ضمیر بھی اسی طرف لوٹتی ہے "وصیۃ" چوں کہ مؤنث ہے، اس لیے مذکر کی ضمیر اس کی طرف نہیں لوٹ سکتی تھی، ویسے وصیت اور ایصاء کا مفہوم ایک ہی ہے۔ "اِثْمُهُ" کی ضمیر تبدیلی کی طرف لوٹتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر کسی نے وصیت کرنے والے کی وصیت بدل ڈالی تو اس سے وصیت کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی نہیں آتی، اس کا اجر تو اس کی نیت کے مطابق اللہ کے یہاں ملے گا ہی، البتہ گناہ تبدیلی کرنے والے پر ہوگا۔ ہم نے جو تفسیر بیان کی اسی کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، سدی، عطاء بن ابی رباح، حسن، عبداللہ بن معمر اور سلیمان بن بشار سے بھی منقول ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ" بے شک اللہ بڑا سننے والا ہے، بڑا جاننے والا ہے، وہ سب کچھ سنتا ہے کہ تم اس کے حکم کے مطابق وصیت کرتے ہو یا نہیں اور تمہاری نیتوں کو خوب جانتا ہے کہ تمہارا ارادہ وصیت میں کسی پر ظلم و زیادتی تو نہیں ہے۔

"فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ" یعنی کوئی شخص مریض کے پاس آیا، اس کی موت کا وقت قریب ہے اور وہ اس وقت وصیت کر رہا ہے، یہاں اس نے دیکھا کہ وصیت کرنے والا غلطی سے یا ظلماً ایسی وصیت کر رہا ہے جس کا اسے حق نہیں پہنچتا، تو ایسے حالات میں اس شخص کے لیے جو وہاں موجود ہے اور مرنے والے کی وصیت سن رہا ہے کوئی حرج نہیں اگر وہ اس کے اور اس کے ورثاء کے درمیان صلح کرا دے، یعنی وصیت کرنے والے کو وصیت میں عدل و انصاف ملحوظ رکھنے کے لیے کہے اور اللہ نے اس کے لیے اس سلسلے میں جو اجازت دی اس سے آگے بڑھنے سے روکے۔ یہ تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مرنے والے نے جن کے لیے وصیت کی ہے ان میں سے کسی کو یا مسلمانوں کے حاکم کو وصیت کرنے والے کی طرف سے وصیت میں غلطی یا ظلم کا علم ہوا اور وہ موصیٰ لہم (جن کے لیے وصیت کی گئی ہے) اور ورثاء کے درمیان صلح کرا دے، یعنی اس کی وصیت میں عدل و انصاف کے ساتھ تبدیلی کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، وہ اس کا مجاز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، ربیع اور ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

تیسرا قول عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ "موت کے وقت وصیت کرنے والے کے عطیہ کے متعلق اگر کسی کو علم ہو جائے کہ اس میں غلطی یا زیادتی کی گئی ہے، یعنی مرنے والے نے بعض وارثوں کو ان کے حق سے کم دے دیا اور بعض کو زیادہ، تو ایسی صورت میں کوئی گناہ نہیں اگر کوئی شخص وارثوں کے درمیان صلح کرا دے۔"

چوتھا قول طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ مرنے والے نے وصیت کسی غیر وارث رشتہ دار کے حق میں کی لیکن اس کا بالواسطہ نفع وارث کو پہنچتا، اس صورت میں اگر کوئی شخص وارثوں میں صلح کرا دے تو کوئی گناہ نہیں۔ ہمارے نزدیک پہلا قول جو مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے زیادہ صحیح ہے۔ "جَنَفٌ" یعنی ظلم، خطا اور حق سے تجاوز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، عطاء، ضحاک اور سُدّی رحمہم اللہ سے یہ معنی نقل ہیں۔ "اِثْم" جان بوجھ کر غلطی اور حد سے تجاوز۔ مجاہد، ربیع، ابراہیم نخعی، عطیہ، طاؤس، ابن زید اور ضحاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل ہے، یعنی "جَنَفٌ" بمعنی خطاء، غلطی جو

Marfat.com

نادانستہ طور پر ہو جائے اور "اِثْمًا" جو جان بوجھ کر ہو۔
"اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" یعنی اگر وصیت کرنے والا سمجھانے پر وصیت میں خطاء یا ظلم سے باز آگیا تو "بے شک اللہ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں اور بڑے رحم کرنے والے ہیں" کہ صرف اس کے ارادۂ ظلم پر مواخذہ نہیں کریں گے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے)

الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ

لوگوں پر فرض کیا گیا تھا اس توقع پر کہ تم روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔ پھر

كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ

(اس میں بھی اتنی آسانی کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو یا (شرعی) سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار کر کے (ان میں روزہ رکھنا)

عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا

اس پر (واجب) ہے اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے (وہ) ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) اور جو

فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

شخص خوشی سے (زیادہ) خیر کرے (کہ زیادہ فدیہ دے) تو اس شخص کے لیے اور بھی بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا (اس حال میں) زیادہ بہتر ہے اگر تم (روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

روزے کے احکام

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" یعنی اے وہ لوگو جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہو، روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں۔

"اَلصِّیَامُ" مصدر ہے، اسی سے "صُمْتُ عَنْ كَذَا" استعمال ہوتا ہے یعنی میں فلاں چیز سے رک گیا۔ اس کا اصل مفہوم "اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے رک جانا" ہے۔ "صَامَتِ الْخَیْلُ" اس وقت بولتے ہیں جب گھوڑا چلنا بند کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا" میں بھی "صَوْم" سے مراد خاموشی ہے۔

"كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" یعنی "جیسا کہ روزے ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں"۔ آیت کے مفہوم اور ہمارے روزوں اور ہم سے پہلی امتوں کے روزوں میں تشبیہ کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس روزہ کے متعلق بتایا ہے جو اس نے ہم پر فرض کیا ہے کہ وہ اسی جیسا ہے جو اس سے پہلے نصاریٰ پر فرض کیا گیا تھا، لیکن انھوں نے اس میں تبدیلیاں کر دیں۔ ہمارے اور ان کے روزے وقت اور مقدار دونوں میں یکساں تھے جس طرح دن میں روزے رکھنا ہم پر فرض ہیں ان پر بھی فرض تھے۔ تشبیہ اسی باب میں ہے۔ یہ قول شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔

Marfat.com

دوسرا قول یہ ہے کہ نصاریٰ پر دن ڈوبنے کے بعد دوسرے دن ڈوبنے تک روزہ فرض تھا۔ ابتدا میں مسلمانوں پر بھی انھیں اوقات میں روزہ فرض ہوا تھا پھر بعد میں منسوخ ہوکر سحر سے دن ڈوبنے تک ہوگیا۔ اس قول کے مطابق بھی آیت میں "عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ" سے نصاریٰ ہی مراد ہیں۔ سدی سے روایت ہے کہ نصاریٰ پر بھی رمضان کا روزہ فرض تھا اور وہ بھی افطار کے بعد اگر سو لیتے تو کھا پی نہیں سکتے تھے لیکن چونکہ اس طرح روزے کے ایام کبھی جاڑے میں آتے اور کبھی گرمی میں، اس لیئے انھوں نے اس میں دشواری محسوس کرکے تبدیلی کرلی۔ مسلمانوں پر رمضان کے روزے انھیں اوقات میں فرض تھے، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور طلوع فجر سے دن ڈوبنے تک روزہ رکھنا فرض ہوا۔ ربیع سے بھی یہی قول نقل ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ" سے تمام اہل کتاب مراد ہیں۔ یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔

چوتھا قول، جو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے، یہ ہے کہ اس سے مراد تمام لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ رمضان میں روزے کے حکم سے پہلے ہر مہینے میں تین دن کے روزے لوگوں پر فرض تھے۔ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب لیا جائے اور اس کے بعد "اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ" (گنتی کے چند دن) سے مراد رمضان کا پورا مہینہ لیا جائے، کیونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آنے والے تمام لوگوں کو آپ کی اتباع کا حکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امام بناکر بھیجا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا دین حنیفیت اور اسلام تھا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس باب میں وہی حکم ہے جو آپ سے پہلے انبیاء کو تھا۔ تشبیہ وقت میں ہے، یعنی ہم سے پہلے لوگوں پر بھی رمضان کے مہینے کے روزے اسی طرح فرض تھے جس طرح ہم پر فرض ہیں۔ "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" یہ حکم اس لیئے ہے تاکہ تم کھانے پینے اور عورتوں کے ساتھ ہم بستری سے بچو۔ یعنی میں نے تم پر روزہ، اور ان تمام امور سے رکے رہنا جن سے اگر تم نہ رکے رہے تو روزہ دار نہیں سمجھے جاؤگے، اس لیئے فرض قرار دیا تاکہ تم ان چیزوں سے بچو جو تمہارے روزے کو توڑ دینے والی ہیں۔ یہ تفسیر سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نقل ہے۔

"اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ" یعنی جو روزے تم پر فرض کیئے گئے ہیں وہ "گنتی کے چند روزے ہیں"۔ یہاں "اَنْ تَصُوْمُوْا" "(تاکہ تم روزے رکھو) محذوف ماناجائے گا۔ "گنتی کے چند روز" کے روزوں سے مراد کے سلسلے میں مفسرین سے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہر مہینے میں تین دن کے روزے ہیں۔ اس قول کے مطابق یہ روزے رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے لوگوں پر فرض تھے۔ ابن عباس اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما اور عطاء اور قتادہ رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہوا ہے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ نے عاشورا اور ہر مہینے میں تین دن روزے رکھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کو فرض کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کے فرض ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو روزے رکھتے تھے وہ نفلی تھے، لیکن آیت میں فرض روزوں کا تذکرہ ہے اور وہ رمضان کے روزے ہیں، اس لیئے اس سے بھی مراد رمضان ہی کے روزے ہیں۔ یہ روایت ابن ابی لیلیٰ سے ہے، اور یہی قول راجح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ مسلمانوں پر رمضان کے سوا اور دنوں کے روزے بھی فرض ہوئے ہیں، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ پہلے رمضان کے سوا دوسرے روزے مسلمانوں پر فرض تھے تو اسے اس کی دلیل دینی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ثبوت کسی حدیث یا روایت ہی سے ہوسکتا ہے

Marfat.com

لیکن ایسی کوئی مضبوط چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لیے جب کہ "اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" فرض روزوں کے ذیل میں ذکر ہوا ہے تو اس سے رمضان ہی کے روزے مراد ہوں گے۔ "مَعْدُودَاتٍ" یعنی گنے چنے۔

"فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ" یعنی پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو کہ روزہ اس کے لیے تکلیف دہ ہو، یا بیمار تو نہ ہو لیکن سفر میں ہو (تو ایسی حالت میں تم روزہ چھوڑ سکتے ہو) اور تم پر ان دنوں کے بدلہ میں جن میں تم نے روزہ چھوڑا ہے دوسرے دنوں میں، جبکہ تم مریض یا مسافر نہ ہو، اتنے ہی دنوں کا روزہ لازم ہے

"وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ" اسی طرح اس آیت کی قرارت پر تمام امت کا اتفاق ہے، اور تمام مصاحف میں بھی اسی طرح ہے۔ اس قرارت کے خلاف قرارت کرنا کسی اہلِ اسلام کے لیے جائز نہیں۔ البتہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ "عَلَى الَّذِينَ يُطَوَّقُونَهُ" پڑھتے تھے۔ "عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ" کی تفسیر کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہیں۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ روزے فرض ہونے کے ابتدائی دنوں میں یہ حکم تھا کہ غیر مسافر اور غیر مریض، جو روزے رکھ سکتے، انھیں بھی اس کی اجازت تھی کہ چاہیں تو روزے رکھیں اور چاہیں نہ رکھیں، البتہ اگر نہ رکھیں تو ہر دن کے روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ یہ حکم پھر بعد میں منسوخ ہو گیا۔ معاذ بن جبل، سلمہ بن الاکوع، ابن عباس اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم، ابن ابی لیلیٰ، علقمہ، عکرمہ، حسن بصری، شعبی، عطاء، ابراہیم، عبیدہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے یہ قول منقول ہے۔ ان حضرات نے فرمایا کہ شروع میں جب روزہ مسلمانوں پر فرض ہوا تو اس کے ساتھ اس کی اجازت و رخصت بھی نازل ہوئی کہ اگر کوئی شخص روزے نہ رکھنا چاہے تو ایک روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو پیٹ بھر کھانا کھلا دے لیکن پھر یہ حکم اس کے بعد کی آیت "سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر روزے رکھے" سے منسوخ ہو گیا۔ گویا رمضان کے روزوں کی فرضیت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اب رمضان میں روزے نہ رکھنے کی صرف مریضوں، مسافروں اور از کار رفتہ بوڑھوں کو اجازت باقی رہی۔ اس قول کی بنیاد پر آیت کا ترجمہ ہوگا "اور جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہیں (اگر نہ رکھنا چاہیں تو) ان کے ذمہ فدیہ ہے (اور وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے"۔ آیت کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں سب کے لیے روزہ توڑنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ صرف بوڑھوں کے لیے یہ حکم تھا، لیکن بعد میں جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا اور اب جوانوں کی طرح بوڑھوں پر بھی روزہ فرض ہو گیا، البتہ اگر بوڑھوں میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو تو وہ روزہ توڑ سکتے ہیں اور ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا دیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر، عکرمہ، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی کسی بھی آیت سے منسوخ نہیں ہے، بلکہ محکمات میں سے ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ "جو لوگ اپنی جوانی اور صحت کی حالت میں روزے کی طاقت رکھتے ہوں، جب وہ بیمار پڑ جائیں یا بوڑھے ہو جائیں اور اس طرح روزہ رکھنے کی ان میں طاقت نہ رہے تو ایسے لوگوں پر لازم ہے کہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں"۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روزے کی فرضیت کے بعد کسی وقت بھی مسلمانوں سے، روزے کی طاقت و استطاعت کے باوجود، اس کا حکم اٹھا لیا گیا تھا کہ اگر وہ فدیہ دے دیں تو انھیں روزہ توڑنے کی اجازت تھی۔ ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنہما، سدی اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ سُدّی رح نے فرمایا کہ آیت میں ایسے شخص کا حکم بیان ہوا ہے جو روزہ رکھ رہا تھا اور اسے روزہ رکھنے کی طاقت تھی، پھر اسے کوئی عذر پیش آ گیا اور وہ روزہ رکھنے سے مجبور ہو گیا۔ مثلاً بیمار ہو گیا، یا

Marfat.com

عورت ہے اور اس کے دودھ پلانے کے دن رمضان میں پڑ گئے وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے لئے آیت میں حکم بیان ہوا ہے کہ وہ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے تو انھیں ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلانا ضروری ہے۔

بعض حضرات نے "يُطَيَّقُونَهُ" کے بجائے "يُطَوَّقُونَهُ" پڑھا ہے۔ یہ قرات ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہا اور بہت سے دوسرے اسلاف رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ "جو روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں، ان کے ذمہ ہر روز ایک مسکین کا فدیہ ہے"۔ ان حضرات رحمہ اللہ نے کہا کہ آیت بوڑھے مردوں اور عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی کہ اگر بڑھاپے کی وجہ سے ایسے لوگ روزے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور روزہ رکھنے میں انھیں تکلیف ہو تو روزانہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دیا کریں۔ ان حضرات نے فرمایا کہ یہ آیت ہرگز منسوخ نہیں، بلکہ محکم ہے اور اس پر اس کے نزول کے بعد سے قیامت تک عمل ضروری ہے۔ حضرت علی، ابن عباس، عائشہ رضی اللہ عنہم، عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، ابن جریج، ضحاک اور عطاء رحمہم اللہ سے مذکورہ بالا تفسیر نقل ہوئی ہے۔ عطاء نے فرمایا کہ جس بوڑھے آدمی میں روزہ رکھنے کی سکت ہی باقی نہ ہو اس کے لیے فدیہ دینے کا حکم ہے، لیکن اگر مشکل کے ساتھ ہی سہی، بہرحال رکھ سکتا ہو تو اسے معذور نہیں سمجھا جائے گا۔ میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ یہ آیت اس سے بعد آنے والی آیت "سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر روزہ رکھے"، سے منسوخ ہے، کیونکہ "عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهُ" میں "ہٗ" کی ضمیر سے مراد "روزہ" ہے، اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اور جو کوئی روزہ کی طاقت رکھتا ہو اس کے ذمہ فدیہ ہے (اگر وہ روزہ نہ رکھے، اور وہ فدیہ) ایک مسکین کا کھانا ہے"۔ اس پر تو بہرحال تمام ہی اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص تندرست و صحتمند ہے اور روزہ رکھ سکتا ہے اور مسافر بھی نہیں تو رمضان کے پورے مہینے میں روزے رکھنا اس پر فرض ہے اور روزہ توڑ کر اس کے بدلہ فدیہ دینا جائز نہیں۔ امت کا یہ اجماع بتاتا ہے کہ زیر تفسیر آیت منسوخ ہے (کیونکہ اس میں بلا کسی قید کے روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت ہے)۔ جو روایات ہم نے معاذ بن جبل، ابن عمر اور سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہم سے اس سلسلے میں نقل کی ہیں اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لوگ رمضان کے مہینے کے روزے رکھتے تھے، لیکن اگر کوئی نہ رکھتا تو اسے ایک مسکین کا کھانا فدیہ کے طور پر دینا پڑتا تھا اور یہ ایک دن کے روزہ کا بدلہ ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر جب اس کے بعد کی آیت "سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر روزہ رکھے" نازل ہوئی تو پہلا حکم فدیہ کا منسوخ ہو گیا اور اب مجبوری کی چند مخصوص صورتوں کو چھوڑ کر ہر شخص پر روزہ رکھنا فرض ہو گیا۔ اس کے بدلے میں فدیہ دینے کی اجازت باقی نہیں رہی۔ البتہ مریض اور مسافر کے لیے رمضان کے روزے چھوڑنے کی اجازت ہے، اس طرح آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، جس کے راوی انس رضی اللہ عنہ ہیں، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت بھی رمضان کے روزے چھوڑ سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رمضان کا مہینہ آ جائے اور عورت حمل سے ہے یا دودھ پلا رہی ہے اور روزے رکھنے کی اس میں طاقت نہیں تو اسے بھی روزے چھوڑنے کی اجازت ہے۔

ابتداء اسلام میں، جب روزے کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت تھی، تو ایک روزہ کے بدلے کتنا فدیہ دینا واجب تھا؟ اس سلسلے میں اہل علم کے کئی اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق آدھا صاع (سوا دو سیر) گیہوں کسی مسکین کو دینا واجب تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک مد (تقریباً ایک سیر) اور ایک دن کے کھانے کی دوسری ضروریات۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آدھا

Marfat.com

ابن جریر

صاع گیہوں یا ایک صاع کھجور یا مُنَقّٰی دینا تھا۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ روزہ توڑنے والا جو کچھ بھی روزہ توڑنے والے دن کھائے گا وہ سب کچھ ایک مسکین کو دینا ضروری تھا۔ وغیر ذالک۔

"فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ" (اور جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے اس کے حق میں بہتر ہے)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر یہ نقل ہے کہ "جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے، یعنی ایک مسکین کے بجائے دو مسکینوں کا کھانا دیدے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔" مجاہد، طاؤس، عطاء اور سُدّی رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے، یعنی فدیہ کے ساتھ روزہ بھی رکھ لے تو اس کے حق میں بہتر ہے۔" یہ ابن شہاب رحمۃ اللہ سے روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں نقل ہے کہ "ایک مسکین کے کھانے میں اضافہ کر دے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔" بہرحال آیت کے الفاظ عام ہیں، اور جتنے اقوال اس کی تفسیر میں بیان کیے گئے ہیں سب کے لیے گنجائش ہے کہ سب ہی نیکی کی صورتیں ہیں۔

"وَأَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" یعنی رمضان کے مہینے میں جو روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں اگر انھیں رکھو تو یہ تمہارے لیے روزے چھوڑ کر فدیہ دینے سے بہتر ہے۔" سدی، ابن شہاب اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم سے یہ تفسیر منقول ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى

(وہ تھوڑے دن) ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لیے

لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ

(ذریعہ) ہدایت ہے اور دوسرا (وصف) واضح الدلالہ ہے منجملہ ان کتب کے جو کہ (ذریعہ) ہدایت (بھی) ہیں اور (حق و باطل میں) فیصلہ کرنیوالی (بھی) ہیں

مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى

سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اسکو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہیئے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو

سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ

تو دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار کر کے ان میں روزہ) رکھنا اس پر (واجب) ہے اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے

وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ

اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ (ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو (کہ ثواب میں کمی نہ رہے) لہذا تم لوگ اللہ تعالیٰ کی

عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

بزرگی (و ثنا) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا جس سے تم برکات صیام رمضان سے محروم نہ رہو گے (اور عذر سے خاص رمضان میں روزہ رکھنے) کی اجازت اس لیے دیدی (تاکہ تم لوگ (اس نعمت آسانی پر اللہ کا) شکر ادا کیا کرو۔

Marfat.com

بابرکت مہینہ، اس کے فرائض اور رخصتیں

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ "شَهْرٌ" (مہینہ) کی اصل "شُهْرَةٌ" ہے، بولتے ہیں "شَهَرَ فُلَانٌ سَیْفَهٗ" فلاں نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی، سونت لی، "شَهَرَ الشَّهْرُ" یعنی مہینے کا چاند طلوع ہوا۔ "رَمَضَانُ" نام کی وجہ، زبان عرب پر بصیرت و معرفت رکھنے والے بعض حضرات کی نظر میں، یہ ہے کہ (بعض سالوں میں) جو شدت کی گرمی اس مہینے میں پڑتی ہے اس کی وجہ سے یہ نام پڑا، (رمض، بمعنی شدت کی گرمی سے ماخوذ) اسی طرح کی مناسبت کے پیش نظر اس مہینے کو جس میں حج کیا جاتا ہے "ذوالحجہ" کہتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اس مبارک مہینے کو صرف "رمضان" کہنا پسند نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہو، اس لیے اسے "شَهْرُ رَمَضَانَ" (رمضان کا مہینہ) کہنا چاہیے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اسی طرح استعمال کیا ہے۔ "شَهْرُ" کو رفع اور نصب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "(یہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا" قرآن مجید رمضان ہی کے مہینے میں لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا، پھر اللہ تعالیٰ جب اور جس طرح چاہتا رہا آسمان دنیا سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آہستہ آہستہ اتارتا رہا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر، سدی اور شعبی رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت میں ہے کہ قرآن مجید لوح محفوظ سے ایک ہی مرتبہ میں پورا کا پورا رمضان کے مہینے میں "بیت معمور" پر اتار دیا گیا تھا۔ بیت معمور آسمان دنیا میں ستاروں کی جگہ کا نام ہے۔ یہیں پر قرآن لاکر محفوظ کیا گیا، اور پھر یہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا جاتا رہا۔ واثلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ" رمضان المبارک کی پہلی رات میں نازل کیے گئے، توریت بھی رمضان ہی میں نازل کی گئی، انجیل رمضان کے تیرہ دن گذرنے کے بعد نازل کی گئی، اور قرآن مجید چوبیس رمضان کو شب قدر میں نازل کیا گیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ" (بے شک ہم نے نازل کیا قرآن کو لیلۃ القدر میں) میں اسی مضمون کا ذکر ہے۔

"هُدًی لِّلنَّاسِ" وہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے "(حق کے راستہ کی طرف)" "بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی" یعنی اس میں ہدایت کے کھلے ہوئے دلائل ہیں، جن سے اللہ کے حدود، اس کے فرائض اور اس کے حرام و حلال کا علم ہوتا ہے "وَالْفُرْقَانِ" سے مراد حق و باطل کے درمیان امتیاز ہے، سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں صاف طور پر حلال و حرام بیان کر دیا گیا ہے۔

"فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ" (سو تم میں سے جو کوئی اس مہینے کو پائے، لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر روزے رکھے) "شُهُوْدِ شَهْر" (مہینے کو پالینا) سے مراد ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ رمضان کے چاند کے طلوع ہونے کے وقت وہ کسی سفر وغیرہ میں نہیں تھا، بلکہ اپنے گھر ہی مقیم تھا۔ یعنی جب رمضان کا مہینہ آیا اور ایک آدمی اپنے گھر ہی مقیم ہے، تو اس پر فرض ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے، خواہ اس کے بعد مقیم رہے یا مسافر۔ البتہ اگر رمضان کا چاند سفر میں دیکھا تو اسے اجازت ہے چاہے روزہ رکھے یا نہ رکھے (اور بعد میں قضا کرے)۔ عبیدہ سلمانی، سدی اور ابراہیم رحمہم اللہ سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ بھی یہی فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص رمضان کے مہینے کی ابتدا کے وقت مقیم تھا، اور پھر سفر شروع کیا تو اس پر روزہ رکھنا ضروری ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ام ذرہ

Marfat.com

نے بیان کیا کہ میں رمضان میں آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؓ نے پوچھا کہ کہاں سے آرہی ہو؟ میں نے کہا کہ اپنے بھائی حنین کے پاس سے۔ پوچھا کہ وہ کیسے ہیں؟ کہا کہ میں جب ان سے رخصت ہوئی تو سفر کا ارادہ کر رہے تھے۔ آپؓ نے اس پر فرمایا کہ ان سے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ سفر نہ کریں، اگر سفر کے دوران میں رمضان کے مہینے کو میں پالوں تو اس کے لیئے میں کہیں اقامت کر لوں گی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "جو کوئی رمضان کے مہینے کو پالے، تو اس مہینے کے جتنے دن اس نے پائے ہیں ان میں روزے رکھے"۔ ابو میسرہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ آپ کے متعلق راویوں کا بیان ہے کہ آپ رمضان کے مہینے میں سفر کے ارادہ سے نکلے اور روزے سے تھے، راستہ میں دریائے فرات آیا تو آپ نے اس کا پانی پی کر روزہ توڑ لیا۔ علی رضی اللہ عنہ کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ سعد رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ سے تین میل دوران کی ایک زمین پر تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا ہم مدینہ واپس لوٹے تو علی رضی اللہ عنہ اس تو سواری تھی لیکن میں پیدل تھا چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا لیکن مجھے انھوں نے روزہ توڑنے کا حکم دیا جسری اور سعید بن مسیب رحمہا اللہ نے فرمایا کہ اگر رمضان شروع ہونے کے وقت کوئی شخص مقیم تھا، پھر بعد میں اس نے سفر تو وہ روزہ توڑ سکتا ہے۔ شعبی نے رمضان میں سفر کیا تو ایک مقام پر پہنچ کر روزہ توڑ لیا۔ شعبہ نے بیان کیا کہ میں نے رمضان میں سفر کا ارادہ کیا تو حکم اور حماد رحمہا اللہ سے اس کے متعلق پوچھا۔ ان حضرات نے فرمایا کہ سفر کرو۔ حماد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ رمضان کے ابتدائی دس دنوں کے بعد میں مقیم رہنا ہی پسند کروں گا۔

تیسرے قول میں آیت کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ "جو شخص عاقل، بالغ اور مکلف ہونے کی حالت میں رمضان کو پالے لازم ہے کہ مہینہ بھر روزہ رکھے"۔ یہ قول ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب رح کا ہے۔ آپ حضرات فرماتے تھے کہ رمضان کا مہینہ آیا اور ایک شخص عاقل بالغ ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے۔ پھر اگر اس پر رمضان ہی میں جنون کی کیفیت طاری ہو گئی، اور رمضان ختم ہونے کے بعد تک یہ بیماری جاتی رہی تو اس پر لازم ہے کہ ان دنوں کے روزوں کی قضا کرے جن میں وہ جنون میں مبتلا تھا، کیونکہ اس نے رمضان کے مہینے کو پایا تھا اور روزہ اس پر فرض تھا یہی حکم اس شخص کا ہوگا جس پر جنون پہلے ہی سے طاری تھا اور اسی حال میں رمضان کا مہینہ آگیا لیکن رمضان کے ختم ہونے سے پہلے ہی اسے افاقہ ہو گیا، تو چونکہ اس نے بھی رمضان کے مہینہ کو پالیا ہے۔ اس لیے حالت صحت میں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ لیکن اس کے برخلاف اگر رمضان کا پورا مہینہ گذر گیا اور از اول تا آخر وہ جنون کی حالت میں ہی رہا تو اس پر رمضان کے روزوں کی قضا لازم نہیں کیونکہ وہ رمضان کے مہینہ کا پانے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ آیت کے معنی تفسیر ہے۔ اگر جنون ایسی چیز ہے کہ اس سے پورے مہینہ کا روزہ ساقط ہو سکتا، جبکہ رمضان شروع ہونے سے پہلے سے ختم ہونے کے بعد تک کسی شخص پر طاری رہا ہو، تو رمضان کے شروع ہونے کے بعد درمیان میں کسی پر طاری ہونے کی صورت میں بھی ان دنوں کے روزے ساقط ہونے چاہئیں جن میں جنون کا عارضہ رہا ہو۔ دونوں صورتوں میں فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کی عقل جنون یا کسی بھی وجہ سے جاتی رہی، اور رمضان کی ابتداء سے پہلے سے ختم کے بعد تک یہ کیفیت رہی، پھر بھی چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا فرض ہے[1]۔

[1] "شہود" کے معنی موجود ہونے کے ہیں۔ اہل عرب اس معنی میں اسے عام طور سے استعمال کرتے ہیں۔ اراہ کو (باقی برصفحہ ۲۷۲)

Marfat.com

جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقیم ہونے کی حالت میں رمضان کو پالے، یعنی رمضان کا جب چاند دکھائی دیا تو وہ مقیم تھا، ایسا شخص اگر بعد میں رمضان کے دنوں میں سفر کرے گا تو اس پر لازم ہے کہ روزے رکھے اور سفر کا عذر کر کے لے نہ توڑے تو یہ تفسیر قطعی طور پر باطل اور بے بنیاد ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپؐ فتح مکہ کے موقعہ پر مدینہ سے رمضان میں نکلے تھے اور رمضان کے بہت سے دن گذر چکے تھے جن میں آپؐ نے روزے رکھے تھے پھر جب سفر شروع کیا تو آپؐ نے خود بھی روزہ توڑا اور صحابہؓ کو بھی توڑنے کا حکم دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ نے رمضان میں مدینہ سے مکہ کا سفر کیا، جب آپ مقام "عسفان" پر پہنچے تو آپؐ نے پانی منگوایا، پھر آپؐ نے پانی کے برتن کو اپنے ہاتھ پر رکھا، تاکہ سب لوگ دیکھ لیں اور اس کے بعد آپؐ نے پانی پی لیا ایک روایت میں ہے کہ دس یا بیس دن رمضان کے گذرنے کے بعد آپؐ نے فتح مکہ کا یہ سفر شروع کیا تھا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھارہ رمضان کے بعد سفر میں نکلے، ہم میں سے بہت سے لوگ روزہ سے تھے اور بہت سوں نے روزہ توڑ لیا تھا، نہ روزہ داروں نے روزہ توڑنے والوں پر کوئی اعتراض کیا اور نہ توڑنے والوں نے رکھنے والوں پر۔

تین اقوال میں سے دو کے متعلق واضح ہوگیا کہ وہ صحیح نہیں ہیں، اس لیے دوسری تفسیر یعنی "جو کوئی رمضان کے مہینے کو پالے تو جتنے دن اس نے مقیم ہونے کی حالت میں پائے ہیں ان میں روزے رکھے لیکن اگر کوئی شخص مریض ہے یا مسافر ہے تو دوسرے دنوں میں چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا اس پر لازم ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۳) عربی میں "شاہد"، اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ واقعہ کے وقت موجود ہوتا ہے۔ "شَهِدَ الشَّهْرَ" کا بھی مفہوم یہ ہوگا کہ "جو کوئی رمضان کے مہینہ میں موجود ہو" تو لازم ہے کہ روزہ رکھے۔ اصلاً آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو لوگ رمضان میں زندہ ہوں ان پر روزہ لازم ہے۔ لیکن نابالغ بچوں پر سب کا اتفاق ہے، کہ روزہ واجب نہیں ہے، اس لیے علماء نے موجود ہونے کی دو صورتیں بتائی ہیں، ایک ذاتاً موجود ہونا، اور دوسرے عقلاً موجود ہونا۔ عقلاً موجود ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ رمضان کے مہینے اور اس کے احکام کا اسے شعور و احساس بھی ہو۔ اور اس تفصیل کے بعد ہر غیر عاقل، غیر بالغ اور غیر مکلف شخص اس آیت کے حکم سے نکل جاتا ہے۔ علامہ ابن جریرؒ نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ جنون کی کیفیت اگر شروع سے آخر تک رمضان کے مہینے میں طاری رہی تو اس پر روزہ آخر کیوں نہیں فرض ہے جبکہ احنافؒ کے نزدیک بھی ایسے مجنون پر اس رمضان کے پورے مہینے کا روزہ فرض ہے جو اس مہینے کے بعض دنوں میں صحت مند رہا ہو اور اس پر ان دنوں جنون کی کیفیت طاری نہ رہی ہو، حالانکہ سب کہتے ہیں کہ اگر نابالغ بچہ رمضان میں بالغ ہوگیا تو بلوغ کے بعد کے دنوں کے روزے اس پر فرض ہوں گے۔ یہی صورت مجنون کی بھی ہے۔ کیونکہ دونوں کے احکام اس حیثیت سے اس باب میں یکساں ہیں کہ دونوں "عقلاً شہود شہر" نہیں رکھتے۔ اصل میں علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو تفسیر منسوب کی ہے وہ آیت کی تفسیر سے زیادہ ایک فقہی مسئلہ ہے جو اصلاً اجتہاد و استنباط سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کے استنباط کے وقت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دوسرے دلائل و شواہد بھی تھے۔ تفسیر کے ذیل میں اس مسئلہ کو اس طرح ذکر کرنا جیسا کہ مصنفؒ نے کیا ہے، مغالطہ پیدا کرتا ہے۔ جہاں تک راجح تفسیر کا تعلق ہے تو احناف کے نقطۂ نظر سے بھی وہی تفسیر راجح ہے جسے مصنفؒ نے راجح قرار دیا ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

"وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ" یعنی جو کوئی رمضان کے مہینہ میں مریض ہو یا سفر میں ہو اور روزہ نہ رکھے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے بدلے میں رمضان کے بعد اتنے ہی دنوں کے روزے رکھے جتنے دنوں کے روزے اس نے رمضان میں چھوڑے ہیں۔ "مرض" جس کی وجہ سے رمضان کا روزہ توڑنا جائز ہے، اس کی حد کی تعیین میں اہلِ علم کے کئی اقوال ہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد ایسا مرض ہے جس میں مریض نماز کے لیئے کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو حسن اور ابراہیم رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ہر وہ مرض جس میں روزہ رکھنا مرض کی زیادتی کا باعث بن سکتا ہو، اس میں روزہ توڑنا جائز ہے محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ہر وہ مرض مراد ہے جسے عرفِ عام میں مرض کہا جا سکتا ہو۔ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں طریف بن تمام عطاردی حاضر ہوئے، رمضان کا مہینہ تھا۔ ابن سیرین رح کھانا کھا رہے تھے، لیکن طریف رح نے کچھ نہیں پوچھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میری اس انگلی میں درد ہو گیا تھا، اس لیئے میں نے روزہ نہیں رکھا ہمارے نزدیک بہتر قول یہ ہے کہ اسی مرض میں روزہ توڑنے کی اجازت ہے جس میں روزہ رکھنا ناقابلِ برداشت ہو، اگر کسی مریض کی اس درجہ بری حالت ہو تو وہ روزہ توڑ سکتا ہے، اور اس کے بدلہ میں اتنے ہی دنوں کے روزوں کی قضا کرے جتنے روزے اس نے نہیں رکھے ہیں۔ "فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ" کا مفہوم ہے "ان دنوں کے سوا دوسرے گنے چنے دن"۔ "أُخَرَ" "أُخْرَىٰ" کی جمع ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ مرض کی حالت میں روزہ توڑنا اللہ کی طرف سے عزیمت ہے اور واجب ہے، صرف رخصت کے درجہ کی چیز نہیں کہ چاہا توڑ دیا اور چاہا نہ توڑا۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حالتِ سفر میں روزہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ رض نے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے، اگر تم کسی کو کوئی چیز خوشی سے دو اور وہ لینے سے انکار کر دے تو کیا تمہیں غصہ نہیں آئے گا؟ سفر کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزہ کی رخصت کا بھی یہی حال ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزہ رکھے گا پھر بھی اس پر اس کی قضا لازم ہو گی۔ چناں چہ عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے سفر میں روزہ رکھا تھا تو آپ نے اس سے دوبارہ روزہ رکھنے کے لیئے کہا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسی حالت میں قضا کا حکم دیا تھا۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں روزہ کا حکم عام حالات میں دیا ہے، اور اس کے بعد مریض اور مسافر کا اس سے استثنا کیا ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی قضا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم صرف مقیم کے لیئے ہے، اس لیئے جس طرح مقیم کے لیئے روزہ توڑنا جائز نہیں اسی طرح مسافر اور مریض کے لیئے روزہ رکھنا درست نہیں، کیونکہ وہ رمضان کے پانے والے نہیں ہیں، ان پر روزہ دوسرے دنوں میں فرض ہے۔ ان کے اس خیال کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول حدیث سے ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ مقیم ہو کر روزہ توڑنے والا۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا صرف مباح اور رخصت ہے، ورنہ رمضان میں روزہ بہر حال فرض ہے، اور جو شخص بھی ان دنوں میں روزے رکھے گا اپنا فرض ادا کر دیگا، البتہ اگر مسافر یا مریض روزہ نہیں رکھے

Marfat.com

توروزہ کی بھی اجازت ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جب مدینہ کے گورنر تھے تو آپ کی ایک مجلس میں سفر میں روزہ پر بحث ہوئی۔ سالم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سفر میں روزہ نہیں رکھتے تھے۔ عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سفر میں روزہ رکھتی تھیں ..... سالم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں تو ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اتباع کروں گا، اور عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی اتباع کروں گا۔ دونوں حضرات کی آواز بلند ہوگئی تو عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اے اللہ معاف کر، جب فراخی ہو تو (سفر میں بھی) روزہ رکھو، اور جب تنگی ہو تو نہ رکھو۔ سالم بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک سفر میں تھے، رمضان المبارک کے چند دن باقی رہ گئے تھے، آپ نے فرمایا کہ بہتر ہے کہ اب ہم روزے رکھ لیں۔ چنانچہ آپ نے روزہ رکھا اور آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی رکھا۔ پھر ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس آ رہے تھے۔ جب مقام روحاء پہنچے تو رمضان المبارک کا چاند دکھائی دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب سفر بھی ختم ہو چکا ہے، اب اگر ہم روزہ رکھیں اور اس مبارک مہینہ کا کوئی حصہ ہم سے نہ جانے دیں تو بہتر ہے۔ بیان کیا کہ آپ نے بھی روزہ رکھا اور آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی۔ خیثمہ کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سفر میں روزے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے غلام کو روزہ رکھنے کے لیے کہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا (یعنی نہ رکھنے کی صرف رخصت ہے) میں نے عرض کی آیت "مَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ" کی کیا توجیہ ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی تو ہم بھوکے سفر کرتے تھے اور جب پڑاؤ ہوتا تب بھی پیٹ نہیں بھرتا تھا لیکن آج سفر کے وقت بھی ہم پیٹ بھر لیتے ہیں اور جب قیام ہوتا ہے جب بھی ہم پیٹ بھر سکتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا سفر میں روزہ نہ رکھے تو اللہ کی طرف سے اس کی بھی رخصت ہے اور اگر رکھے تو یہ افضل ہے۔ یہ قول عثمان بن ابی العاص سے بھی مروی ہے۔ عطاء، سالم بن عبداللہ، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ اشعث بن سلیم کہتے ہیں کہ میں مکہ معظمہ کے ایک سفر میں اپنے والد، اسود بن یزید، عمرو بن میمون اور ابو وائل رحمہم اللہ کے ساتھ تھا۔ یہ حضرات سارے سفر میں روزہ سے رہے، رمضان میں بھی اور غیر رمضان میں بھی۔ قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے صالح نے پوچھا کہ ہم سردی کے موسم میں رمضان میں سفر کرتے ہیں، اگر انہیں دنوں میں روزہ رکھ لوں تو گرمیوں میں اس کی قضا سے آسان رہتا ہے۔ قاسم بن محمد نے فرمایا کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تم پر تنگی نہیں ڈالنا چاہتا، جو آسان صورت ہے وہی اختیار کر لو۔ یہی قول ہمارے نزدیک راجح ہے، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ایسا مریض جسے روزہ نہ رکھنا چاہیے تھا، رمضان کے مہینے میں اگر روزہ رکھ لے تو اس کا روزہ ادا ہو جاتا ہے اور صحت کے بعد دوبارہ اس پر قضا نہیں باقی رہتی، ظاہر اس باب میں مسافر اور مریض کے معاملہ میں کوئی فرق نہیں، جب مریض کا روزہ مرض اور رخصت کے باوجود ادا ہو جاتا ہے تو مسافر کا بھی ادا ہو جائے گا، آیت میں جہاں مریض اور مسافر کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت آئی ہے، وہاں دونوں کا ذکر کسی فرق کے بغیر ایک ساتھ کیا گیا ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان دونوں کے حکم میں فرق کیا جائے۔ اس کے بعد ہی ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے، تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا" کیا اس سے بڑھ کر کوئی دشواری اور تنگی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص جو سفر کی دشواریوں میں روزے رکھ چکا ہے اس سے پھر دوبارہ اتنے ہی دن مزید روزوں کے لیے کہا جائے۔ اگر کوئی کم عقل شخص یہ کہنے لگے کہ وہ روزے تو فرض ہی نہیں تھے، تو اس کے سامنے یہ آیت لائی جائے گی کہ "اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے"، یہ روزے رمضان کے فرض ہیں اور مقیم و مسافر، مریض و

تندرست کے کسی امتیاز کے بغیر سب پر فرض ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی تواتر کے ساتھ آیا ہے کہ مسافر کے لیے رمضان کے روزے چھوڑنے کی صرف رخصت ہے، اگر چاہے تو رکھ سکتا ہے اور چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ حمزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر میں روزہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اگر چاہو تو رکھ لو اور اگر چاہو چھوڑ دو۔ حمزہ اسلمی رضی اللہ عنہ ایک روایت میں خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، یا رسول اللہ میں لگاتار روزے رکھتا ہوں، کیا سفر میں بھی رکھ سکتا ہوں؟ آں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے رخصت ہے، پس جو روزے رکھتا ہے وہ اچھا کرتا ہے اور جو چھوڑتا ہے اس کے لیے کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ حمزہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، چاہے سفر میں ہوں یا حضر میں۔ عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی ہمیشہ، خواہ سفر ہو یا حضر، روزہ رکھتے تھے اور یہی معمول ابو مراوح رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ اگر ہم اس باب کی روایتیں بیان کرنے لگیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا صرف رخصت ہے، نہ کہ عزیمت، تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث اور نقل ہوئی ہے، اس کی روایتیں بھی مسلسل اور متواتر ہیں، اور اس کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ گھیرے ہوئے ہیں اور اس پر سایہ کر رکھا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون شخص ہے؟ صحابہؓ نے بتایا کہ روزہ دار۔ آں حضورؐ نے فرمایا کہ "سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے"۔ لیکن اس حدیث میں قابل غور یہ ہے کہ آں حضورؐ نے یہ ارشاد ایک ایسے روزہ دار کے متعلق فرمایا جس کا روزہ کی وجہ سے برا حال تھا کہ دوسروں کو اس کی حفاظت اور اسے آرام پہنچانے کی ضرورت پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے کے متعلق فرمایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر اپنی جان کی حفاظت فرض قرار دی ہے اور اسے دانستہ ہلاکت میں ڈالنا حرام رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ روزہ بھی وہی نیکی و طاعت ہوگا جس کی ترغیب اللہ نے دی ہے۔ جو روزہ جان لیوا ثابت ہو وہ کس طرح نیکی ہو سکتا ہے؟ اس سے تو اللہ نے روکا ہے۔ اس مضمون کی جو احادیث آں حضورؐ کی طرف منسوب کی گئی ہیں کہ سفر میں روزہ رکھنے والا حضر میں روزہ توڑنے والے جیسا ہے، اول تو اس حدیث کی جتنی سندیں ہیں وہ سب لغو اور ناقابل اعتبار ہیں، اور اگر اس مضمون کی حدیث ثابت بھی مان لی جائے تو اس کا بھی منشا وہی ہوگا جو اس سے پہلے والی حدیث کا ہے کہ جب روزہ ہلاکت کا باعث ہو تو اسے توڑ دینا ضروری ہے۔

"یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ" یعنی اے مومنو، اللہ نے تمہیں جو سفر اور مرض کی حالت میں روزہ توڑنے کی رخصت دی ہے، تو یہ محض تمہاری آسانی کے لیے ہے، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ ان حالات میں روزہ تمہارے لیے دشوار ہو سکتا ہے، اور اللہ تم پر دشواری اور تنگی نہیں کرنا چاہتا، کہ سب کچھ جانتے ہوئے سفر اور بیماری میں بھی تم پر روزہ فرض رکھے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے کہ "الیسر" (سہولت) سے مراد سفر میں روزہ نہ رکھنا اور "العسر" (دشواری) سے مراد سفر میں روزہ رکھنا ہے۔ آپ سے سفر میں روزے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک میں سہولت ہے اور دوسرے میں دشواری، پس اللہ کی دی ہوئی سہولت کو اختیار کرو۔ مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی آیت کی یہی تفسیر نقل ہوئی ہے۔

"وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ" یعنی یہ کہ تم نے رمضان کے جتنے دنوں کے روزے سفر یا مرض کی وجہ سے چھوڑ دیئے

Marfat.com

ہیں دوسرے دنوں میں جب تم سفر سے لوٹ آؤ یا مقیم ہو جاؤ تو اتنے ہی روزے قضا کر لو۔ یہ تفسیر ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔

"وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ" اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کیا کرو، اس احسان پر کہ اس نے تمھیں وہ راستہ بتا دیا ہے جسے دوسرے دین والوں نے بھلا دیا تھا، حالانکہ تمہاری طرح ان پر بھی رمضان کے روزے فرض تھے لیکن وہ گمراہ ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنی مخصوص نوازشوں کے نتیجہ میں ہدایت دی اور اپنے فرض کی ادائیگی کی توفیق بخشی، اس لیے تمھیں طاعت و عبادت کے ذریعہ اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور عید الفطر کے دن کی تکبیر کے ذریعہ اس کی عظمت بیان کرنی چاہیئے۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے کہ مراد عید الفطر کی تکبیرات ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مسلمانوں پر یہ ضروری ہے کہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو تکبیر کہنا شروع کر دیں، اور عید سے فارغ ہونے تک تکبیر کہتے رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اور یہ کہ تم شمار کی تکمیل کر لیا کرو، اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمھیں راہ بتا دی"۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ صبح کے وقت عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر کہیں، جب بیٹھیں جب بھی تکبیر کہتے رہیں، لیکن جب امام منبر پر آ جائے تو خاموش ہو جائیں۔ پھر جب امام تکبیر کہے تو سب لوگ تکبیر کہیں، لیکن امام کے آنے کے بعد صرف اس کی تکبیر پر تکبیر کہی جائے گی، اس کے سوا خود سے نہ کہنی چاہیئے۔ پھر جب امام فارغ ہو گیا اور نماز پوری ہو گئی تو عید بھی پوری ہو گئی۔ زید بن اسلم سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ "وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" اور تاکہ تم اللہ کے ان انعامات و احسانات پر اس کا شکر ادا کرو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو (آپ میری طرف سے فرما دیجئے) میں قریب ہی ہوں (اور باستثنا ر تمنا درخواست) منظور کر لیتا ہوں

الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ

(ہر) عرضی درخواست کرنیوالے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے سو ان کو چاہیئے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین رکھیں

لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ○

امید ہے کہ وہ لوگ رشد (و فلاح) حاصل کر سکیں گے۔

میں اپنے بندوں کے قریب ہی ہوں

"وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" یعنی اے محمد، اگر میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کریں کہ میں کیا ہوں، تو میں ان سے قریب ہی ہوں، ان کی دعاؤں کو سنتا ہوں اور دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں"۔ آیت کے شان نزول کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اے محمد، کیا ہمارا رب ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کے انداز میں دعا کریں، یا دور ہے کہ اسے پکار پکار کر متوجہ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ میں اپنے بندوں سے

Marfat.com

ابن جریر قریب ہی ہوں، جب دعاء کرنے والا مجھ سے دعاء کرتا ہے تو میں اس کی دُعاء قبول کرتا ہوں۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ”مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دُعاء قبول کروں گا“........ تو کچھ لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کس وقت اللہ سے دعاء کرنی چاہیے؟۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اس قول کی بنیاد پر آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جس وقت بھی تم مجھ سے دُعاء کرو، میں تمہارے قریب ہی ہوں اور تمہاری دعاؤں کو سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں۔ یہ قول عطاء بن ابی رباح اور سدی رحمہما اللہ سے روایت ہے۔ سدیؒ نے فرمایا کہ جب بھی کوئی مومن بندہ اللہ سے دعاء کرتا ہے تو اللہ اس کی دعاء قبول کرتا ہے، البتہ جس چیز کی وہ دُعاء کرتا ہے اگر وہ اس کے لیے مقدر ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے وہ چیز مل جاتی ہے، اور اگر مقدر نہیں ہوتی تو آخرت میں اس کے بدلے اُسے ثواب ملتا ہے اور دنیا میں پیش آنے والی کوئی ناگوار چیز اس سے دفع کر دی جاتی ہے۔ ابن صالح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمیں یہ حدیث معلوم ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کوئی بندہ ایسا نہیں جسے دعاء کی توفیق دی گئی ہو اور پھر اس کی دعاء قبول نہ کی گئی ہو۔ گرنمی خواستے دادنمی دادے خواست۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جب آیت ”مجھ سے دعاء کرو، میں تمہاری دُعاء قبول کروں گا“ نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ”ہم اللہ سے دعاء کس رخ ہو کر کریں؟“ اس پر آیت ”جس طرف بھی تم اپنا رخ پھیرو، اللہ ادھر ہی ہے، بے شک اللہ بڑا وسعت رکھنے والا، بڑا جاننے والا ہے“ نازل ہوئی۔

چوتھا قول یہ ہے کہ ان لوگوں کے جواب میں نازل ہوئی جنہوں نے کہا تھا کہ ہم اللہ سے دعاء کس طرح کریں؟۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ قول قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

”فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي“ پس تم بھی میرے احکام قبول کرو اور میری اطاعت کرو۔ ”استجاب“ بھی اجابت کے معنی میں آتا ہے۔ یہ تفسیر مجاہد اور ان کے علاوہ مفسرین کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مفہوم ہے ”پس تمہیں چاہیے کہ مجھ سے دعاء کرو“ یہ معنی ابورجاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہیں۔

”وَلْيُؤْمِنُوا بِي“ ”اور مجھ پر ایمان لاؤ اور میری تصدیق کرو۔ لیکن جو حضرات ”فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي“ کا مفہوم ”پس تمہیں چاہیے کہ مجھ سے دعاء کرو“ بیان کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ ”میں تمہاری دعاء قبول کروں گا“ ابورجاء خراسانی سے یہی معنی نقل ہیں۔

”وَلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ“ ”اور تاکہ تم لوگ اس عمل کے نتیجہ میں ہدایت پا جاؤ۔

بہت سے لوگ دعاء کرتے ہیں اور ان کی دعاء قبول نہیں ہوتی یعنی اللہ تعالیٰ سے جس چیز کی طلب و دعاء کرتے ہیں وہ انھیں نہیں ملتی۔ یہ ایک مشاہدہ امر ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیت میں بلا کسی تخصیص کے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعاء کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے، حالانکہ ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ بہت سی دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟۔ اس کا جواب دو طرح دیا گیا ہے ایک یہ کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص عمل کے ذریعہ مجھے پکارتا ہے یعنی میری اطاعت کرتا ہے اور احکام کی پیروی کرتا ہے تو میں اس کے اس عمل کو قبول کرتا ہوں اور اس پر ثواب دیتا ہوں۔ اس صورت میں ”اجابة“ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کرنے والوں سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرتا ہے، حدیث میں بھی دعاء کو عبادت کہا گیا ہے، نعمان بن بشیر

Marfat.com

رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دعاء عبادت ہے، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعاء قبول کروں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں انھیں جہنم میں ذلیل وخوار داخل کیا جائے گا۔" اس حدیث میں آں حضور علیہ السلام نے بتایا ہے کہ دعا بھی عبادت ہے، اور دعا کرنے کا مطلب عبادت وطاعت ہے حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عمل وطاعت ہی اس کا مفہوم بیان کیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگرچہ آیت کے الفاظ عام ہیں لیکن مفہوم میں عموم نہیں، بلکہ دعاء کی قبولیت اللہ کی مشیت پر موقوف ہے یعنی اگر میں چاہتا ہوں تو دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا کیونکہ وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے

لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ

بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو۔ خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم خیانت (کر) کے گناہ میں

أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ

اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا سو اب ان سے ملو ملاؤ

وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ

اور جو (قانون اجازت) تمہارے لیے تجویز کر دیا ہے (بلا تکلف) اس کا سامان کرو اور کھاؤ اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید

الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا

خط (یعنی نور) صبح (صادق) کا متمیز ہو جاوے سیاہ خط سے پھر (صبح صادق سے) رات تک روزہ کو

الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ

پورا کیا کرو اور ان بیبیوں سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو

فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ

مسجدوں میں۔ یہ خداوندی ضابطے ہیں سو ان سے نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور)

اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں اس امید پر کہ وہ لوگ (مطلع ہو کر خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

روزہ کے مسائل "أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ" یعنی جائز کر دیا گیا ہے تمہارے لیے

Marfat.com

روزہ کی رات میں اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا"۔ "الرَّفَثُ" سے آیت میں کنایۃً جماع وہم بستری سے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ "رفث" سے مراد جماع ہے لیکن اللہ تعالیٰ کریم ہیں، اور کنایہ واشارہ کے الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ قتادہ، مجاہد، سالم بن عبداللہ اور سُدّی رحمہم اللہ سے بھی یہی مفہوم نقل ہے۔ اس لفظ کے اصلی معنی "شہوت انگیز کلام" کے ہیں۔

"هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" "تمہاری بیویاں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"۔ "لباس" کے اصلی معنی ہیں "وہ چیز جو پہنی جائے"۔ آیت میں بیویوں کو ان کے شوہروں کا اور شوہروں کو ان کی بیویوں کا "لباس" کہنے کی وجہ بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ ایک ہی کپڑے میں وہ سو جاتے ہیں اور دونوں کا جسم ایک دوسرے سے اس طرح مل جاتا ہے گویا وہ ایک دوسرے کے لیے لباس ہیں۔ لباس بول کر کلامِ عرب میں بعض اوقات "جسم" بھی مراد لیتے ہیں، اور یہ استعمال اشعارِ عرب میں بھی پایا جاتا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کا مطلب بیان فرمایا کہ "تم ان کے لیے اوڑھنا ہو اور وہ تمہارے لیے اوڑھنا ہیں"۔

دوسرا قول اس سلسلے میں یہ ہے کہ "لباس" سے مراد باعثِ سکون ہے۔ ایک اور موقع پر یہی لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَجَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا" "تمہارے لیے رات کو لباس بنایا یعنی باعثِ سکون بنایا۔ چونکہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے باعثِ سکون ہیں، اس لیے انھیں ایک دوسرے کے لیے "لباس" کہا گیا۔ یہ مفہوم مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین سے نقل ہے۔ جو چیز کسی چیز کو چھپا لے اور اس کی وجہ سے لوگ اسے نہ دیکھ سکیں اسے بھی "لباس" کہتے ہیں، یعنی وہ اس کے لیے پردہ بن گئی۔ آیت میں جو میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس کہا گیا ہے اس کا بھی مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے پردہ بن جاتے ہیں، یعنی وہ ایک دوسرے کے لیے باعثِ سکون ہیں، ایک دوسرے کے لیے پردہ پوش ہیں۔ مجاہد قتادہ، سُدّی، عبدالرحمٰن بن زید رحمہم اللہ سے آیت کی مذکورہ بالا تفسیر منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔

"عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ" "اللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا کرتے تھے لیکن اس نے تم پر رحمت سے توجہ فرمائی اور تم سے درگذر کر دی، سو اب تم ان سے ملو ملاؤ اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے)۔ جس خیانت کا آیت میں ذکر ہوا ہے وہ دو چیزوں میں ہوتی تھی، ایک بیویوں کے ساتھ جماع اور دوسرے کھانے پینے میں، حالاں کہ یہ چیزیں ان کے لیے اس وقت حرام تھیں۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ ابتداءِ اسلام میں ہر مہینے میں تین دن کے روزے تھے۔ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو سب لوگ اس پر عمل کرنے لگے لیکن صورت یہ تھی کہ اگر افطار کے وقت کوئی شخص کھانا نہ کھا لیتا اور سو جاتا تو پھر اسے اگلے دن کے ختم ہونے تک کھانے کی اجازت نہیں تھی، اسی طرح افطار کے بعد اگر میاں بیوی میں سے کوئی بھی سو جاتا تو انھیں دوسرے دن کے ختم ہونے تک ہم بستری کی اجازت نہیں تھی۔ ایک مرتبہ ایک بوڑھے انصاری صحابی جن کا نام صرمہ بن مالک رضی اللہ عنہ تھا، آئے اور اپنی بیوی سے کھانا لانے کے لیے کہا، بیوی نے کہا کہ کھانا گرم کر لوں تو لاتی ہوں۔ اتنے میں ان صحابی رض کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گئے۔ دوسرا واقعہ عمر رضی اللہ عنہ کا پیش آیا آپ گھر میں آئے اور اپنی بیوی سے ہم بستری کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ میں سو چکی ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

سمجھا کہ یوں ہی بہانہ کرتی ہیں اور آپ نے ان کے ساتھ ہم بستری کی۔ دونوں حضرات اپنے فعل پر رات بھر توبہ کرتے رہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس لغزش پر مطلع ہو گیا ہے، اب پہلا حکم بدل دیا جاتا ہے اور تم صبح صادق کے طلوع تک کھا پی سکتے ہو اور عورتوں کے ساتھ ہم بستری کر سکتے ہو۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، اگر افطار کے بعد کوئی سو لیتا تو اس کا دوسرے دن کا روزہ شروع ہو جاتا اور اس پر کھانا پینا اور دوسری تمام چیزیں جو روزہ دار نہیں کر سکتا، حرام ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ ابو صرمہ نامی ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ اپنی زمین میں دن بھر کام کر کے تھکے ماندے آئے لیکن نیند آگئی (اور کھانا نہ کھا سکے) صبح اٹھے تو شکستہ دکھائی دے رہے تھے صبح کو جب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا تو دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے، کیوں اتنے شکستہ حال نظر آتے ہو؟۔ انھوں نے اپنا واقعہ بیان کیا۔ ایک دوسرے صاحب عورت کے بارے میں خیانت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت براء بن عازب، ابن عباس اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم سے بھی تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد دوسرے دن کا روزہ شروع ہو جاتا تھا، آپ نے فرمایا کہ کئی مسلمان کھانے اور عورتوں کے بارے میں رمضان کے مہینے میں عشا بعد خیانت میں مبتلا ہوئے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے متعلق فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی طرح انھیں بھی اپنی بیوی کے ساتھ ابتلاء پیش آگیا تھا۔ مجاہد، قتادہ، سدی، عطاء، عکرمہ اور محمد ابن یحییٰ رحمہم اللہ سے اس باب کی روایتیں سابق مضمون کی منقول ہیں۔

"مباشرۃ" (جس سے باشروھن بنا ہے) کلام عرب میں "چمڑے کا چمڑے سے ملنا ہے" آیت میں اس سے کنایہ جماع اور ہم بستری سے ہے۔ یہ مفہوم ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کریم ہے اور وہ اس طرح کے مضمون کو کنایہ ہی میں بیان فرماتا ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں بھی "مباشرت" جماع کے لیے استعمال ہوا ہے اور قرآن مجید میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سدی اور مجاہد رحمہما اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔

"وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" (اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے) کے مفہوم کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد "اولاد" ہے۔ مجاہد، حکم، عکرمہ، حسن، سدی، ربیع اور ضحاک بن مزاحم رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اس قول کی روایت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد "لیلۃ القدر" ہے۔ یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ "ہر وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے اور جس کی رخصت و اجازت دی ہے" مراد ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فرمایا ہے ایک قراءت اس میں "واتبعوا" (بغیر واو) ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس اختلاف قراءت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ دونوں صحیح ہیں جس طرح چاہو پڑھو۔ میرے نزدیک اس آیت کی بہتر تفسیر یہ ہے کہ "ابتغوا" طلب و تلاش کرنے کے معنی میں ہے، یعنی تلاش کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ وہ تمہارے لیے مباح و جائز ہے اس کی طلب و تلاش کرو۔ اس ذیل میں جماع کے ذریعہ بچہ کی طلب، لیلۃ القدر کی تلاش اور وہ تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے جائز و مباح کی ہیں آجاتی ہیں ان کے علاوہ آیت ان تمام معانی خیر کو حاوی ہے جو مطلوب ہیں اور جو انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دی

Marfat.com

ہیں۔ البتہ آیت سے مراد "اولاد" لینا آیت کی ترتیب اور اس کے الفاظ سے زیادہ قریب ہے۔ اس سے پہلے کے الفاظ میں جماع اور ہم بستری ہی کا ذکر ہے" اب ان سے ملو ملاؤ"، اس لیئے اس کے بعد کے "اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیئے لکھ دیا ہے" سے اگر اولاد مراد لی جائے تو یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے، خصوصاً ان دو دوسرے اقوال کے مقابلہ میں جو نہ آیت کی ترتیب سے واضح ہوتے ہیں اور نہ ان کی صحت کے لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول ضامن ہے۔ " وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ" (اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے، پھر روزہ کو رات ہونے تک پورا کرو) مفسرین کے اس باب میں مختلف اقوال نقل ہیں کہ "جب تک تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے" سے کیا مراد ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ "سفید خط" سے دن کی روشنی، سپیدۂ صبح مراد ہے، اور "سیاہ خط" سے رات کی تاریکی مراد ہے۔ اس قول کی بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ روزے کے مہینہ میں رات میں کھاؤ پیو اور اولاد کی طلب میں اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، رات کی ابتداء سے سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے تک یہ سب کچھ کرو، جب رات کی تاریکی سے صبح کا سپیدہ طلوع ہونے لگے تو پھر تمہارا روزہ شروع ہو جاتا ہے اور اب تم ان اعمال میں سے کوئی عمل نہ کرو۔ یہ قول حسن، سدی، قتادہ رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ قتادہ نے صبح کاذب کا بھی ذکر کیا کہ طلوع صبح سے پہلے کچھ دیر کے لیئے ایک سفیدی نمودار ہوتی ہے، اسے دیکھ کر یا کسی مؤذن کی اذان سن کر جو لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیئے دے رہا ہو، کھانے پینے سے نہ رک جاؤ بلکہ جب نور کا تڑکا دیکھ لو، جو صبح کاذب کے کچھ دیر بعد ہوتا ہے اور روشنی شرقاً غرباً پھیلنے لگتی ہے تب کھانے پینے سے رک جاؤ اور روزہ شروع کر دو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قول نقل ہوا ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے مجھے اسلام کی تعلیم دی اور نماز کا طریقہ سکھایا کہ ہر نماز کو اس کے وقت میں کس طرح ادا کیا جائے۔ پھر فرمایا کہ جب رمضان آئے تو "کھاؤ اور پیو جب تک کہ صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے پھر روزہ کو رات ہونے تک پورا کرو"، لیکن میں اس کا مفہوم نہیں سمجھا اور میں نے دو دھاگے (دخط) بنائے، ایک سفید اور ایک سیاہ اور صبح کے وقت انھیں دیکھتا رہا، لیکن اس وقت دونوں دھاگے یکساں ہی نظر آتے تھے۔ میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ! آپؐ نے جتنی باتیں مجھے سکھائی تھیں وہ سب میں نے سمجھ لیں اور یاد کر لیں لیکن "سفید خط اور سیاہ خط"، کا مجھے مطلب سمجھ میں نہیں آیا؟۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا، ابن حاتم! کیا دشواری تمھیں پیش آئی اور آپؐ مسکرائے، جو کچھ میں نے کیا تھا غالباً آپ اسے سمجھ گئے تھے۔ میں نے عرض کی کہ میں نے دو دھاگے بنائے تھے، ایک سفید اور ایک سیاہ اور رات ہی سے انھیں دیکھنا شروع کر دیا تھا (کہ دونوں میں جب امتیاز ہونے لگے تو کھانا پینا بند کر دوں) لیکن وہ یکساں ہی نظر آتے رہے ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر ہنس دیئے اور آپؐ کے سامنے کے دندان مبارک دکھائی دیئے، پھر فرمایا کیا میں نے تم سے "مِنَ الْفَجْرِ (صبح کا) بھی نہیں کہا تھا، اس سے مراد تو دن کی روشنی (سپیدۂ صبح) اور رات کی تاریکی ہے!۔ سہل بن سعد سے روایت ہے کہ پہلے "مِنَ الْفَجْرِ" کے الفاظ نازل نہیں ہوئے تھے، بلکہ صرف یہ نازل ہوا تھا کہ "جب تک کہ تم پر سفید خط سیاہ خط سے نازل نہ ہو جائے"، پھر کچھ لوگوں کو جب روزہ رکھنا ہوا تو انھوں نے سفید اور سیاہ دھاگے اپنے دونوں پاؤں میں باندھ لیئے اور اس وقت تک کھاتے پیتے رہے جب تک دونوں دھاگے ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے، چنانچہ اللہ تعالٰی

Marfat.com

نے "مِنَ الْفَجْرِ" نازل کیا، یعنی صبح کا سفید خط رات کے سیاہ خط سے جب تک نمایاں نہ ہوجائے اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ ان تمام حضرات کا جن کا قول اوپر مختلف روایتوں میں بیان ہوا یہ کہنا ہے کہ "صبح کے سفید خط کا سیاہ خط سے نمایاں ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ دن کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہوجائے۔ دن کی اس سفیدی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آسمان میں (شرقاً غرباً) پھیل جاتی ہے اور راستوں اور کھلی جگہوں میں بھی نمایاں ہوجاتی ہے، اس سے پہلے ایک اور روشنی آسمان پر کچھ دیر کے لیے (شمال وجنوب میں) ظاہر ہوتی ہے، وہ یہاں مراد نہیں، وہ صبح کاذب ہے۔ ابو مجلز، مسلم، عبدالرحمٰن بن ثوبان رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی روایت ہے۔ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمہیں بلال (رضی اللہ عنہ) کی اذان (جو طلوع صبح صادق سے پہلے رمضان میں خاص طور سے روزہ داروں کو متنبہ کرنے کے لیے دی جاتی تھی) اور لمبی روشنی سحری کھانے سے نہ روک دے بلکہ وہ سپیدۂ صبح مراد ہے جو افق میں پھیل جاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "سفید خط" سے مراد سورج کی روشنی ہے، اور "سیاہ خط" سے مراد "رات کی تاریکی"۔ ابراہیم تیمی کہتے ہیں کہ میرے والد حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رمضان میں مدائن جا رہے تھے، جب صبح صادق ہوگئی تو آپ نے پوچھا، کیا تم میں سے کوئی کھانا پینا چاہتا ہے؟ ہم نے کہا کہ جس کا ارادہ روزہ رکھنے کا ہوگا وہ کھا پی نہیں سکتا۔ پھر ہم کچھ دور تک چلے، اور جب فجر کی نماز کا آخری وقت ہوگیا تو آپ نے پھر پوچھا، تم میں کوئی سحری کھانا چاہتا ہے؟ ہم نے کہا کہ جسے روزہ رکھنا ہوگا وہ اب سحری نہیں کھائے گا۔ آپ نے فرمایا لیکن مجھے روزہ رکھنا ہے اور میں اب سحری کھاؤں گا۔ چنانچہ آپ اترے اور سحری کھائی، پھر نماز پڑھی۔ علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ ہے وہ وقت جب "صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہوجاتا ہے"۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رمضان کے مہینہ میں میں سحری کھا کر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، انھوں نے مجھ سے ایک مشروب پینے کی فرمائش کی۔ میں نے کہا کہ میں سحری کھا چکا ہوں۔ انھوں نے اصرار کیا تو میں نے پی لیا۔ پھر ہم باہر آئے تو لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ عامر بن مطر سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ان کے گھر حاضر ہوا، اپنی سحری انھوں نے میرے سامنے بھی پیش کی، چنانچہ ہم نے ان کے ساتھ کھایا، پھر نماز کی اقامت کہی گئی اور ہم نے باہر نکل کر نماز پڑھی۔ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے مولا سالم بیان کرتے ہیں کہ میں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک رمضان میں ایک ہی چھت پر رہتے تھے، ایک رات میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! کیا آپ سحری نہیں کھائیں گے؟ انھوں نے ہاتھ کے اشارہ سے مجھے رکنے کے لیے کہا۔ پھر دوبارہ میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! کیا آپ سحری نہیں کھائیں گے؟ آپ نے اس مرتبہ بھی مجھے ہاتھ کے اشارہ سے روکا۔ میں نے تیسری مرتبہ حاضر ہوکر پھر عرض کی اور اس مرتبہ انھوں نے فجر کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارہ سے مجھ سے رکنے کے لیے کہا۔ چوتھی مرتبہ جب میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! کیا آپ سحری نہیں کھائیں گے؟ اس مرتبہ آپ نے طلب فرمائی اور کھایا۔ پھر دو رکعت (فجر کی سنت) پڑھی اور اس کے بعد نماز (فرض) کے لیے کھڑے ہوئے۔

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ نماز وتر کا وقت رات میں (آخری رات میں، جو اس کا افضل وقت ہے) ہے اور سحری کا دن میں۔ لیکن خود ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ہی سے اس کے خلاف قول نقل ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ وتر اور سحری دونوں کا وقت رات میں ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ نماز وتر اور سحری کے درمیان میں اتنے وقت کا فصل

Marfat.com

ابن جریر

ہونا چاہیئے جتنا تثویب اور اقامت میں ہوتا ہے۔ بہرحال اس قول کی تائید میں جو اقوال ہم نقل کر رہے تھے اس سلسلے میں حبان کی بھی ایک روایت ہے، انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ سحری کھائی، فارغ ہو کر جب ہم باہر نکلے تو نماز کی اقامت ہو چکی تھی، چنانچہ ہم نے نماز پڑھی، ایک روایت میں حبان ہی سے منقول ہے کہ میں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر سے گذرا تو وہاں علی رضی اللہ عنہ سحری کھا رہے تھے، جب میں مسجد پہنچا تو نماز کی اقامت کہی گئی۔ ایک روایت میں ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد فرمایا کہ یہ ہے وہ وقت جب "سیاہ خط سفید خط سے ممتاز ہوتا ہے"

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ روزہ کا وقت دن سے شروع ہوتا ہے، رات سے نہیں، اور ظاہر ہے کہ دن کی ابتداء سورج نکلنے سے ہوتی ہے، جیسا کہ دن کی انتہا سورج ڈوبنے پر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر دن کی ابتداء طلوع صبح صادق کو مان لیا جائے تو لازمی طور پر اس کی انتہا غروب شفق کو ماننی پڑے گی، لیکن اس سلسلے میں امت کا اجماع و اتفاق ہے کہ سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی دن ختم ہو جاتا ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سورج کے طلوع پر دن کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث نقل کی جاتی ہے کہ آپ نے طلوع فجر کے بعد سحری کھائی وہ ہمارے اس قول کی صحت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ چنانچہ زر بن حبیش بیان کرتے ہیں کہ میں نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کیا آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں، پھر فرمایا کہ صرف سورج نہیں نکلا تھا، ورنہ جس وقت آں حضور ص کے ساتھ میں نے سحری کھائی اس کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ دن کا وقت تھا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر تم اذان کی آواز سنو اور کھانے کا برتن تمہارے ہاتھ میں ہو تو ضرورت کے مطابق کھا پی کر اٹھو۔ ایک روایت ہے کہ نماز کی اقامت کہی گئی اور برتن عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا، عرض کی، یا رسول اللہ! کیا میں اسے پی لوں؟ فرمایا، ہاں۔ چنانچہ انھوں نے برتن کا مشروب پی لیا۔ بلال رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نماز کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوا، آپ کا ارادہ روزہ رکھنے کا تھا، چنانچہ آپ ص نے برتن منگوایا اور پیا، اور مجھے بھی عنایت فرمایا میں نے بھی پیا، پھر آپ نماز کے لیے تشریف لے گئے۔

میرے نزدیک ان دونوں تفسیروں میں سے وہ تفسیر مناسب و اولیٰ ہے جس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہے کہ "سفید خط" سے مراد دن کی سفیدی (سپیدۂ صبح) اور "سیاہ خط" سے مراد "رات کی سیاہی" ہے۔ کلام عرب میں بھی اس کا یہی مفہوم جانا پہچانا ہے۔ جو احادیث اس سلسلے میں اس طرح کی نقل کی جاتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سحری تناول فرمانے کے بعد نماز کے لیے تشریف لے گئے، یا پانی پینے کے بعد تشریف لے گئے تو اس سے اس قول کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ سحری آپ نے طلوع صبح صادق سے پہلے تناول فرمائی ہوگی، اسی طرح پانی بھی پہلے پیا ہوگا اور پھر نماز کے لیے تشریف لے گئے ہوں گے، یہ عین ممکن ہے، اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فجر کی نماز حضور اکرم ص کے زمانہ میں صبح صادق کے طلوع کے فوراً بعد شروع ہو جاتی تھی اور اذان اس سے پہلے دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ آں حضور ص سحری اس وقت کھاتے تھے جب میں تیر گرنے کی جگہ کو دیکھ سکتا تھا، تو اس سے مراد بھی صبح صادق سے پہلے کا وقت لیا جا سکتا ہے۔

"سفید خط اور سیاہ خط" کی تفسیر میں ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "سفید خط" رات کے نیچے (آخری حصہ میں) ہوتا ہے اور وہ اس میں روشنی پیدا کر دیتا ہے، اور "سیاہ خط" رات کے اوپر (آخری حصہ سے پہلے) ہوتا ہے، اس کے بعد

Marfat.com

"مِنَ الْفَجْرِ" (صبح کا) کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ سفید خط اور سیاہ خط سے مراد وہ خطوط ہیں جو صبح صادق کے وقت نمایاں ہوتے ہیں، صبح صادق کا پورا وقت یہاں مراد نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جوں ہی صبح صادق کے آغاز میں سیاہ خط سفید خط سے نمایاں ہو جائے بس کھانا پینا چھوڑ دو اور روزہ شروع کر دو اور اس وقت سے رات تک روزہ پورا کرو، جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے پہلے روزہ دار کے لیے کھانا پینا جائز ہے ان کی تردید خود اس آیت میں موجود ہے، کیونکہ آیت میں "صبح کے سفید خط کے سیاہ خط سے نمایاں" ہو جانے تک کھانے پینے کی اجازت ہے، اور کون نہیں جانتا کہ صبح کا سفید خط سیاہ خط سے ابتداء صبح صادق ہی کے وقت نمایاں ہوتا ہے، جب رات کی سیاہی سپیدۂ صبح سے مغلوب ہونی شروع ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو کھانے پینے کی حد قرار دی ہے، یعنی کھانا پینا سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے سے پہلے پہلے ختم کر دیا جائے، جو لوگ اس حد سے آگے بڑھ کر سورج نکلنے کو حد مانتے ہیں ان کے سامنے اگر کوئی یہ کہے کہ پھر دوپہر تک ہی کیوں نہ حد مان لی جائے، اور روزہ میں کھانا پینا بس اسی کے بعد ممنوع ہو، تو وہ ایسے شخص کو کسی دلیل سے قائل نہیں کر سکتے، کیونکہ انھوں نے خود ہی روزہ کے دنوں میں کھانے پینے کی اصل حد کو توڑ دیا ہے، اب جو چاہے گا اس اصل حد میں اضافہ کرتا رہے گا۔

"اَلْفَجْرِ" مصدر ہے، اور تَفَجَّرَ الماءُ یَتَفَجَّرُ سے نکلا ہے، اس وقت بولتے ہیں جب پانی پھوٹ پڑے اور بہنے لگے، چوں کہ سورج کی آمد سے پہلے اس کی شعاعیں پھوٹ پڑتی ہیں اور ہر طرف اجالا ہی اجالا ہو جاتا ہے اس لیے اس وقت کو "فجر" کہا گیا۔ "ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ" میں روزہ کا آخر وقت بیان کیا گیا ہے، یعنی جس طرح روزہ کی ابتداء صبح صادق کے طلوع سے ہوتی ہے، جو دن کا ابتدائی وقت ہے، اسی طرح اس کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب رات شروع ہوتی ہے اور سورج ڈوب جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کا روزہ نہیں ہوتا جس طرح روزے کے دنوں میں دن میں کھانا پینا وغیرہ نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی شخص رات دن متواتر روزے رکھتا ہے، وہ کوئی عبادت نہیں کرتا، بلکہ فاقہ کشی کرتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب رات آجائے، دن چلا جائے اور سورج ڈوب جائے تو روزہ دار روزہ توڑ لے۔ عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، آں حضورؐ روزہ سے تھے۔ جب سورج غروب ہو گیا تو آپؐ نے ایک شخص سے فرمایا کہ اتر کر میرے لیے ستو گھول لو۔ انھوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! کاش آپ اور رات ہو لینے دیتے! آں حضورؐ نے پھر دوبارہ ان سے ستو گھولنے کے لیے کہا۔ انھوں نے وہی سابقہ جواب دیا، تیسری مرتبہ پھر آں حضورؐ نے اُن سے فرمایا اور انھوں نے وہی جواب دیا اور یہ بھی کہا کہ یا رسول اللہ، ابھی دن کے آثار باقی ہیں۔ تیسری مرتبہ آں حضورؐ کے کہنے پر وہ اتر گئے اور آں حضورؐ کے لیے انھوں نے ستو گھولا۔ اس کے بعد آں حضورؐ نے فرمایا کہ جب رات ادھر سے نمودار ہو، آپؐ نے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا، تو روزہ دار کو روزہ کھول لینا چاہیے۔ رفیع نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ رات تک فرض کیا ہے، پس دن ڈوبنے کے بعد اگر تم چاہو تو کھاؤ اور چاہو نہ کھاؤ۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے صوم وصال (مسلسل کئی دن و رات درمیان میں بغیر کچھ کھائے پیئے روزہ رکھنا) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر صرف دن کے روزے فرض کیے ہیں، اس لیے جب رات آئے تو کھائے اور چاہے نہ کھائے، بہرحال رات کے وقت روزہ نہیں ہوتا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ صوم وصال شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔

Marfat.com

اس کے باوجود بہت سے اکابرامت سے صومِ وصال ثابت ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ سات سات دن رات مسلسل، درمیان میں کچھ کھائے پیے بغیر، روزہ رکھتے تھے، جب آپؓ بوڑھے ہوگئے تو پانچ پانچ یوم صومِ وصال رکھتے، پھر جب اور بوڑھے ہوگئے تو گھٹا کر تین دن کر دیا تھا۔ ابن ابی نعیم مہینہ بھر میں ایک مرتبہ روزہ کھولتے تھے۔ عامر بن عبداللہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ رمضان میں سولہ سولہ اور سترہ سترہ دن میں روزہ کھولتے۔ اس روایت کے راوی مالک رحمۃ اللہ علیہ ہیں، آپ نے بیان کیا کہ میں نے ان سے پوچھا، ابوالحارث! آپ کس طرح مسلسل اتنے اتنے دن، کھائے پیے بغیر رہ جاتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ میں گھی پی لیتا ہوں اور اس سے میری رگیں تر رہتی ہیں۔ اس طرح کی مثالیں بکثرت ہیں، لیکن اس کی وجہ طاعت وعبادت نہیں، بلکہ نفس کشی اور بھوکے رہنے کی قوت حاصل کرنا مقصود ہوتا تھا، خود وہ اکابر بھی یہ عمل طاعت وعبادت سمجھ کر نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثال عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں ملتی ہے، آپ لوگوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ زندگی موٹی جھوٹی گذارو، تکلفات کے عادی نہ بنو۔ گھوڑے پر کود کر چڑھا کرو اور سفر ہمیشہ سواری ہی پر نہیں بلکہ پیدل بھی کیا کرو۔ عمر رضی اللہ عنہ کا اس ارشاد سے مقصد یہی تھا کہ لوگ آرام پسند نہ بن جائیں، بلکہ سخت کوشی کی زندگی اختیار کریں اور اپنے آپ کو مشکلات کا ہر وقت سامنا کرنے کے لیے تیار رکھیں۔ اس کے باوجود بہت سے اہلِ علم وفضل نے صومِ وصال، یعنی کئی کئی دن رات بعد روزہ کھولنے کو پسند نہیں کیا ہے۔ ابن ابی نعم کے متعلق روایت ہے کہ وہ کئی کئی دن بعد روزہ کھولتے، اور اس دوران میں یہ حالت ہوجاتی کہ اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ عمرو بن میمون رحمۃ اللہ علیہ کو جب ان کے متعلق معلوم ہوا تو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو اگر یہ شخص مل جاتا تو اسے رجم کر دیتے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں تواتر کے ساتھ صومِ وصال کی ممانعت آئی ہے، مثال کے طور پر ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ نے صومِ وصال سے منع فرمایا۔ صحابہؓ نے عرض کی، یارسول اللہ! آپ تو صومِ وصال کرتے ہیں۔ آں حضورؐ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میری حالت تمہاری جیسی نہیں ہے، مجھے رات کے وقت (اللہ کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔ البتہ ایک سحری سے دوسری سحری تک کے روزہ کی اجازت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ نے فرمایا، صومِ وصال نہ کرو، اور اگر کسی کو کرنا ہی ہے تو بس سحری تک کی اجازت ہے (یعنی افطار کے وقت اگر نہ کھائے پیے تو سحری کے وقت ضرور ہی کھا لینا چاہیے)۔ صحابہؓ نے عرض کی، یارسول اللہ! آپ تو صومِ وصال کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں جیسا نہیں ہوں، رات کے وقت مجھے ایک کھلانے والا کھلاتا ہے اور پلانے والا پلاتا ہے۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی ام ولد (باندی) سے روایت ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں گئیں تو آپؐ سحری کھا رہے تھے، آپؐ نے کھانے پر انھیں بلایا تو انھوں نے کہا کہ میں روزہ سے ہوں پھر انھوں نے اس کی صورت بتائی۔ آں حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ اگر صومِ وصال ہی رکھنا ہے تو آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سحری کے وقت سے سحری کے وقت تک رکھ لیا کرو۔ اس لیے "اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ" کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر جن امور سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں صبح کے سفید خط کے سیاہ خط سے نمایاں ہوجانے پر روکا ہے ان سے رات تک رُکے رہنے کو پورا کرو۔ اس کے بعد پھر صبح صادق کے طلوع ہونے تک کھانا پینا تمہارے لیے جائز ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

سے یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔

"وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ" یعنی جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کیے ہوئے ہو، اس حال میں اپنی بیویوں سے صحبت نہ کرو۔ "عکوف" (جو عَاكِفُوْنَ کا ماخذ ہے) کی حالت وہ حالت ہے جب بندہ اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں اپنے کو روکے رکھتا ہے۔ "عکوف" کا اصل مفہوم ٹھہرنا، اور کسی چیز پر اپنے آپ کو روکے رکھنا ہے۔ مفسرین سے "مباشرت" (جو تباشروھن کا ماخذ ہے) جس سے اللہ نے آیت میں روکا ہے کے مفہوم کے سلسلے میں کئی اقوال نقل ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد صرف جماع اور ہم بستری ہے، مباشرت کے اور جو مفہوم ہو سکتے تھے وہ آیت میں مراد نہیں ہیں۔ چناں چہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ رمضان المبارک کا مہینہ ہو یا کوئی اور مہینہ، حالتِ اعتکاف میں، دن یا رات کوئی بھی وقت ہو، عورتوں کے ساتھ ہم بستری نہ کرنی چاہیے۔ عطاء، ضحاک، ربیع، قتادہ، سُدّی اور مجاہد رحمہم اللہ سے بھی یہ قول نقل ہے۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ قضاء حاجت وغیرہ کے لیے معتکفین اپنے گھر جایا کرتے تھے، اور گھر ہی میں اپنی بیویوں سے ہم بستری بھی کر لیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسی سے آیت میں روکا ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ میں نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد میں اپنی بیوی کو بوسہ یا اسے چھونے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ حرام تو ہم بستری ہی کی گئی ہے، لیکن اس طرح کی کوئی چیز بھی مسجد میں پسند نہیں کرتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن پر "مباشرت" کا مفہوم حاوی ہے، مثلاً عورت کو بوسہ دینا، چھونا، ہم بستری کرنا۔ چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ حالتِ اعتکاف میں بوسہ وغیرہ کی طرح کی کسی چیز کے ذریعہ عورت سے لذت نہ حاصل کرے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "مباشرت" میں جماع اور غیر جماع تمام چیزیں آجاتی ہیں اور معتکف کے لیے سب حرام ہیں، وہ مباشرت جس میں ہم بستری نہ ہو اس میں کوئی بھی ایسی صورت آجاتی ہے جس میں مرد کا چمڑا عورت کے چمڑے سے چھو جائے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "مباشرت" کا ایک عام لفظ ذکر کیا ہے اور حالتِ اعتکاف میں اس سے روکا ہے، اس کی کوئی تخصیص نہیں کی کہ فلاں قسم کی مباشرت تو جائز ہے اور فلاں قسم کی جائز نہیں، اس لیے اس لفظ کے مفہوم میں جتنی چیزیں بھی آتی ہیں ان سب ہی سے آیت میں ممانعت سمجھی جائے گی۔

میرے نزدیک پہلا قول راجح ہے، یعنی آیت میں "مباشرت" سے مراد جماع، ہم بستری یا کوئی بھی ایسا عمل جو جماع کے قائم مقام ہو، یعنی جس کے کرنے سے غسل ضروری ہو جاتا ہو۔ آیت کی تفسیر میں صرف یہی دو اقوال ہیں، یعنی ایک قول کے مطابق حکم عام ہے اور دوسرے کے مطابق مباشرت کا ایک خاص مفہوم مراد ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چوں کہ بہت مضبوط اور متواتر روایات کے ذریعہ یہ حدیث ثابت ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کنگھا کیا کرتی تھیں جب آپ حالتِ اعتکاف میں ہوتے تھے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ آیت میں "مباشرت" کا لفظ اپنے عام اور وسیع مفہوم میں نہیں استعمال ہوا ہے، بلکہ ایک مخصوص صورت ہی مراد ہے جس کے لیے یہ لفظ عام طور سے استعمال ہوتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں ہوتے، اور مسجد ہی میں سے اپنا سر میری طرف کر دیتے اور میں اپنے حجرہ میں بیٹھے بیٹھے آپ کے سر مبارک میں کنگھا کر دیتی۔ آپ نے بیان کیا

Marfat.com

کہ جب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم معتکف ہوتے تو گھر میں صرف قضاء حاجت کے لیے تشریف لاتے۔ ایک روایت میں ہے کہ میں حائضہ ہوتی اور اسی حالت میں سر مبارک کو دھوتی اور اس میں کنگھا کر دیتی۔ اس صحیح حدیث کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ آیت میں "مباشرت" سے مراد اس کا عام اور وسیع مفہوم ہے۔ لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ اس لفظ سے مراد اس کی ایک خاص صورت ہے جس میں یہ لفظ عام طور سے استعمال ہوتا ہے یعنی جماع یا کوئی بھی ایسا عمل جو لذت میں اس کے قائم مقام ہو اور اس سے غسل واجب ہو جاتا ہو۔

"تِلْكَ حُدُودُ اللهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا" وہ چیزیں جن کا ذکر اس سے پہلے ہوا یعنی رمضان کے مہینہ میں دن میں کھانا پینا، جماع کرنا، یا حالتِ اعتکاف میں جماع کرنا، ارشاد ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے میں نے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے ان کے قریب بھی نہ جانا، اس سے دور ہی دور رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے ان ضابطوں کو توڑ بیٹھو اور پھر سزا کے مستحق قرار پاؤ، اور ان لوگوں کی صف میں کھڑے کیے جاؤ جو میرے ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے والے اور نافرمان ہیں۔ مفسرین "حُدُودُ اللهِ" کا مفہوم "اللہ کے ضابطے" کہتے ہیں اور میں نے آیت کا جو مطلب لکھا ہے وہ بھی اس سے قریب ہے، بلکہ اس سے زیادہ جچا تلا ہے۔ کسی چیز کی "حد" اسے کہتے ہیں جو گھری ہوئی ہو اور اس طرح اس حد اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کے درمیان امتیاز پیدا کر دیا گیا ہو، اس لیے آیت میں "تِلْكَ حُدُودُ اللهِ" میں اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جو حلال چیزوں سے صاف طور پر ممتاز ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حدود اور ان کی صفات و خصوصیات کھول کر بیان کر دی ہیں۔ "حُدُود" کے معنی "شروط" (ضابطے) سُدّی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔ لیکن ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے "حُدُود" کے معنی "اللہ کی نافرمانی" منقول ہیں۔

"كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ اٰيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ" ارشاد ہے کہ اے لوگو! جس طرح میں نے تمہارے لیے روزہ کی فرضیت کے متعلق صاف طور پر بیان کر دیا، اس کے حدود و اوقات بھی تمہیں مجھ سے معلوم ہو گئے اور اس کی رخصتوں کا بھی علم ہو گیا، اسی طرح میں اپنے تمام احکام، جن کا تعلق میرے حلال و حرام، میرے حدود و ضوابط اور میرے حکم و منع سے ہے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہوں، اور یہ تمام احکام میں اس لیے بیان کرتا ہوں تاکہ وہ میری نافرمانی اور میری معصیت سے بچیں اور اپنے آپ کو میرے غضب و غصہ کا مورد نہ بنائیں

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق (طور پر) مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو احکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ

فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ اور تم کو اپنے جھوٹ اور (ظلم کا) علم بھی ہو۔

یعنی ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ۔ آیت میں "اَمْوَالَكُمْ" (تمہارا اپنا مال) کہا گیا ہے، حالانکہ مراد دوسروں کا مال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بھائی کا مال ناجائز طور پر ہضم کر جانے کو اپنے ہی مال کے ناجائز استعمال کی طرح قرار دیا ہے۔ یہ طرزِ خطاب قرآن مجید میں بکثرت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کے

Marfat.com

درمیان بھائی چارگی اور اخوت قائم کی ہے، اس لیے اپنے بھائی کو قتل کرنے والا گویا خود اپنا ہی قاتل ہے، اپنے بھائی کی بدگوئی کرنے والا اپنی ہی بدگوئی کرنے والا ہے۔ کلام عرب میں بھی یہ استعمال عام تھا کہ اپنے بھائیوں کی چیزوں کو لوگ اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے اور اپنی چیزوں کو اپنے بھائیوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "آپس میں تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ"۔ "اکل بالباطل" (ناجائز طور پر کھانے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا استعمال اور اس میں تصرف تمہارے لیے جائز نہیں کیا ہے، لیکن تم اس کے باوجود اسے استعمال کرو۔

"تُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ" اور نہ ناجائز طور پر اپنے کسی بھائی کا مال اڑا لینے کے لیے حکام تک مقدمے لے جاؤ، یعنی "نہ اسے حکام تک پہنچاؤ" تاکہ اس ذریعے سے لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم حرام طریقہ سے کھا جاؤ"۔

"بِالْإِثْمِ" سے مراد حرام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حرام کیا ہے۔

"وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ" یعنی دراں حالے کہ تم یہ سب کچھ جان بوجھ کر کرو اور حکام تک مقدمہ کو لے جانے کا مقصد ہی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز تمہارے لیے حرام کی ہے اور جو تمہارے بھائی کی ہے اسے اپنی بنا لو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایسے شخص کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس پر اس کے کسی بھائی کا مال ہو، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہ ہو، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مال کا انکار کر دے۔ حق اس کے سامنے واضح ہے اور جانتا ہے کہ یہ مال اس طرح اس کے لیے حرام ہے، لیکن اس کے باوجود حکام تک معاملہ لے جانے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں، کیونکہ اسے اطمینان ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظالم ہوتے ہوئے حکام تک معاملہ نہ لے جاؤ (کہ تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے)۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ قاضی (جج) کا فیصلہ کسی حرام چیز کو حلال یا کسی حلال چیز کو حرام نہیں بنا سکتا، قاضی تو قانون اور گواہی کی مضبوطی اور کمزوری کو سامنے رکھ کر فیصلے کرتا ہے، وہ ایک انسان ہے، اور جس طرح صحیح فیصلے کر سکتا ہے اسی طرح اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے، اس لیے یاد رکھو کہ اگر اس نے کسی کے حق میں غلط فیصلہ کر دیا ہے تو ابھی مقدمہ ختم نہیں ہوا، اس کا آخری فیصلہ باقی ہے اور اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن سب کو جمع کرے گا اس وقت وہ حق و باطل کا صحیح فیصلہ فرمائے گا اور اگر کسی نے دنیا میں دلائل و شواہد کے زور سے غلط فیصلہ اپنے حق میں کروا لیا ہے تو اس دن حق والے کو اس کا حق ملے گا اور یہ حق اسی شخص سے وصول کیا جائے گا جس نے اپنے لیے ناجائز فیصلہ کروا لیا تھا۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "بالباطل" سے مراد تو یہ ہے کہ ایک شخص خود اپنے ساتھی پر ظلم کرتا ہے اور پھر خود ہی حکام تک مقدمہ لے جاتا ہے، اسے معلوم ہے کہ ظلم وہی کر رہا ہے لیکن مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اپنے ساتھی کا مال خود ہضم کر جائے۔ یہی چیز "تُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ" میں بیان کی گئی ہے۔

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جوا ہے جس پر اہل جاہلیت کا عمل تھا۔ "ادلاء" (جو تدلوا کا ماخذ ہے) کا اصل مفہوم ہے "ڈول کو کسی رسی وغیرہ میں باندھ کر کنویں میں لٹکانا"۔ اسی سے اپنے دعویٰ پر دلائل دینے والے کے لیے "أَدْلَى بِحُجَّةٍ كَيْتَ وَكَيْتَ" یعنی اس نے اپنے دعوے کے لیے فلاں فلاں دلائل دیئے۔ کیونکہ دلائل بھی اس کے لیے وسیلہ اور سبب ہیں، اور انھیں کے ذریعہ وہ اپنے مقدمہ کی رسی کو دراز کرتا ہے تاکہ مقصد حاصل ہو جائے جس طرح کنویں سے پانی نکالنے والا ڈول کو رسی وغیرہ کے ذریعہ جو پانی نکالنے کا وسیلہ اور سبب ہیں کنویں میں ڈالتا ہے۔

Marfat.com

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ ط قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط وَلَیْسَ

آپ سے چاندوں کی حالت تحقیقاً کرتے ہیں　آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثلاً عدت و مطالبہ

الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ج وَ

حقوق کے لیے) اور (غیر اختیاری عبادات مثلاً) حج (روزہ و زکوٰۃ وغیرہ) کیلئے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں انکی پشت کی طرف سے آیا کرو ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ

اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ص وَاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور گھروں میں اُن کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو

چاند کی پیدائش کے چند مقاصد

"یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ" کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے مختلف احوال کے متعلق سوال کیا گیا تھا کہ کیوں چاند بالکل باریک ہوتا ہے، اور پھر خود ہی بڑھتے بڑھتے بدر کامل کیسے بن جاتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے متعلق پوچھا تھا کہ آخر اس میں یہ مختلف احوال کیوں رکھے گئے ہیں؟ جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ یہ لوگوں کو روزے، افطار، مناسک حج اور عدت کے اوقات بتانے کا آلہ ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے دینی امور میں اس کے ذریعہ لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیں، یہ روایت ربیع، ابن جریج، سدی اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ ابن عباس اور علی رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا ہے۔ اس قول کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے محمدؐ! لوگ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنی ایک حالت پر کیوں نہیں رہتا، کیوں کبھی باریک ہوتا ہے اور کبھی بدر کامل، کبھی آسمان پر جلوہ نمائی کے لیے موجود اور کبھی روپوش! آخر اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند میں فرق کیوں رکھا ہے کہ اول الذکر تو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا ہے، لیکن چاند کی رگ و پے میں تغیر پذیری سمو دی گئی تو آپ اس کا جواب دے دیجئے کہ ان دونوں کے حالات میں یہ فرق تمہارے رب نے مصلحت اور حکمت کے پیش نظر کیا ہے تم اس کے ذریعے مہینے کے مختلف دن اور رات کے مختلف اوقات معلوم کر سکتے ہو، اور اس طرح روزہ، افطار، قرض کی ادائیگی کا وقت، عورتوں کی عدت کا وقت، حج کے اوقات وغیرہ تمہیں اس کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ "وَالْحَجِّ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے حج کے اوقات معلوم کرنے کا بھی ذریعہ بنایا ہے، اس کے ذریعہ تمہیں اپنے مناسک کا علم ہوتا ہے۔

طاعت کی روح تقویٰ ہے

"وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ج وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا وَاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ"، کہا جاتا ہے کہ یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حالتِ احرام میں گھروں کے اندر دروازے سے نہیں آتے تھے۔ چنانچہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار (اسلام سے پہلے) جب حج کرتے اور واپس آتے تو گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہوتے تھے۔ پھر ایک انصاری حج کر کے آئے اور دروازے سے گھر میں داخل ہو گئے تو لوگوں نے اس رسم شکنی پر نکتہ چینی کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ "طاعت یہ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا جائے، بلکہ طاعت گذار بندہ وہ ہے جو

Marfat.com

تقویٰ اختیار کرے اور فطری طریقہ کے مطابق گھروں میں دروازوں ہی کے ذریعہ داخل ہو۔ قیس بن جبیر کی روایت میں ہے کہ کچھ لوگ دروازے سے اندر نہیں داخل ہوتے تھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب گھر میں دروازے سے داخل ہوئے۔ رفاعہ بن تابوت نامی ایک انصاری صحابی تھے، انھوں نے جب آں حضورؐ کو دروازے سے آتے جاتے دیکھا تو وہ بھی آں حضورؐ کے پیچھے دروازے ہی سے باہر نکلے۔ آں حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے یہاں تو یہ دستور نہیں، تم ہمارے ساتھ دروازے سے کیوں آتے جاتے ہو۔ انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے آپ کو اسی طرح آتے دیکھا اس لیے میں نے بھی آپ کی اتباع کی۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیت کا جو شان نزول بیان کیا گیا وہی مجاہد، ابراہیم، قتادہ، سدی، ربیع اور ابن جریج رحمہم اللہ سے بھی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مدینہ کے کچھ قبائل میں یہ دستور تھا کہ جب انھیں کسی دشمن کا خوف ہوتا تو وہ احرام باندھ لیتے تھے، تاکہ امن حاصل ہو جائے۔ ایسی حالت میں وہ گھر کے دروازے سے آمد و رفت نہیں رکھتے تھے، بلکہ پشت کی طرف دیوار میں نقب ڈال لیتا، اور آنا جانا اسی سے رکھتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں اسی طرح کے محرم ایک صاحب اس وقت تھے۔ حضور اکرمؐ ایک باغ میں دروازے سے داخل ہوئے اور وہ صاحب بھی جو احرام باندھے ہوئے تھے آپ کے پیچھے پیچھے دروازے سے ہی اندر گئے پیچھے سے ایک شخص نے پکار کر کہا کہ اے فلاں، تم تو محرم ہو اور اس کے باوجود دروازے سے باغ میں جا رہے ہو (باغ چہار دیواری سے گھرا ہوا تھا)۔ انھوں نے کہا کہ میں تو قریشی ہوں، پھر انھوں نے حضور اکرمؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ محرم ہیں تو میں بھی محرم ہوں، اگر آپ قریشی ہیں تو میں بھی قریشی ہوں (کہ میرا دین وہی ہے جو آپ کا ہے)۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کے لیے حالت احرام میں دروازے سے گھر میں داخل ہونا جائز قرار دیا گیا۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ ہے کہ اہل مدینہ اور ان کے علاوہ بعض اور قبائل حالتِ احرام میں گھر کے اندر دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ پشت کی طرف دیوار پھاند کر اندر آتے۔ لیکن حضور اکرمؐ ایک دن ایک انصاری صحابی کے گھر میں دروازے سے داخل ہوئے۔ آپ کے پیچھے ایک دوسرے انصاری صحابی بھی، جو احرام باندھے ہوئے تھے، دروازے ہی سے داخل ہوئے۔ لوگوں نے انھیں ملامت کرنی شروع کی اور کہا کہ تم فاجر ہو۔ آں حضورؐ نے بھی ان سے پوچھا کہ محرم ہونے کے باوجود تم دروازے سے کیوں داخل ہوئے؟ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نے آپ کو اسی طرح داخل ہوتے دیکھا اس لیے میں نے بھی آپ کی اتباع کی، آں حضورؐ نے فرمایا کہ میں تو قریش کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ انصاری صحابی نے عرض کی، لیکن میرا اور آپ کا دین تو ایک ہی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کوئی طاعت نہیں ہے کہ احرام کی حالت میں تم دروازوں کے بجائے پشت کی طرف سے گھر میں داخل ہو، بلکہ طاعت گذار بندہ وہ ہے جسے اللہ کا خوف ہو، وہ اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچے، جن چیزوں کا اس نے حکم دیا ہے انھیں بجا لائے۔ پشت کی طرف سے گھر میں آنے کی مشکلات برداشت کرنا اللہ کی کوئی طاعت نہیں ہے، گھر میں اس راستے سے داخل ہو جس سے تمھیں آسانی ہو۔

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" یعنی اے لوگو! اللہ سے ڈرو، اس کے احکام کو بجا لاؤ، جن امور سے اس نے تمھیں روکا ہے اس سے رک جاؤ، تاکہ تمھیں کامیابی اور فلاح حاصل ہو اور تم اس کی ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں کو پا سکو۔

Marfat.com

ابن جریر (ج ۲)

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اور (بے تکلف) تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو (نقض عہد کرکے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد (معاہدہ) سے نہ نکلو واقعی

الْمُعْتَدِينَ ۝ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ

اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں اسوقت خواہ) انکو قتل کرو جہاں انکو پاؤ اور (خواہ) انکو ل

أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ

باہر کرو جہاں سے انھوں نے تم کو نکلنے پر مجبور کیا ہے اور شرارت قتل سے بھی سخت تر ہے اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (و نواح) میں (کہ حرم کہلاتا

الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ

ہے) قتال مت کرو۔ جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔ ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو تم (بھی) انکو مارو ایسے

جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجاویں (اور اسلام قبول کرلیں) تو اللہ تعالیٰ بخش دیں گے اور مہربانی فرمادینگے

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ ۖ فَإِنِ انْتَهَوْا

اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد عقیدہ (شرک) نہ رہے اور ان کا دین (خالص) اللہ ہی کا ہوجاوے اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز

فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۝

آجاویں تو سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی بجز بے انصافی کرنے والوں کے۔

اپنا دفاع کرو لیکن کسی پر ظلم نہ ہونے پائے

"وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ" مفسرین کے اس آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ سب سے پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو مشرکوں کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اس میں مسلمانوں کو حکم ہے کہ جو مشرکین جنگ کریں تو مسلمان بھی ان کا بھرپور جواب دیں، لیکن جو آمادۂ مخاصمت نہیں ہیں انھیں مسلمان بھی نہ چھیڑیں پھر یہ حکم سورۂ براءۃ کی آیات سے منسوخ ہوگیا۔ یہ حکم مدینہ میں نازل ہوا تھا۔ ربیع اور ابن زید رحمہا اللہ سے یہی قول منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ نہیں ہوا، کفار سے جن حالات میں جنگ کرنے کا حکم آیت میں ہے وہ اب بھی موجود ہے۔ آیت میں اعتداء سے جو روکا گیا ہے (ولا تعتدوا) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ میں عورتوں، بچوں اور معذور لوگوں کو مت قتل کرو۔ اور یہ حکم آج بھی قائم ہے، اس لیے آیت کا کوئی جز بھی کسی آیت سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔ یہ قول عمر بن عبد العزیز، مجاہد اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور یہی قول میرے نزدیک راجح ہے۔ نسخ کی

Marfat.com

کوئی دلیل نہیں ہے، آیت میں جو احکام ہیں وہ سب اب بھی نافذ ہیں۔ اس تفسیر کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے مسلمانو! جو کفار تم سے آمادہ جنگ ہوں ان سے میری طاعت میں، میری رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور میرے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق لڑو، لیکن جو لوگ لڑنے کے قابل نہیں ہیں، یعنی کفار کی عورتیں بچے وغیرہ انھیں قتل مت کرو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز ہے، اور اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

"وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ" یعنی اے مسلمانو! جو مشرکین تم سے جنگ کریں ان کے جنگ کے قابل آدمیوں کو تم جہاں بھی پاؤ اور تمہیں موقعہ مل جائے تو قتل کر دو۔ "حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ" کا یہی مفہوم ہے "الثقفة بالأمر" کا مفہوم ہوتا ہے "اس معاملہ میں حذاقت و بصیرت"، جنگ کے سلسلے میں اس لفظ کے استعمال سے مطلب "معاملاتِ جنگ میں مہارت و کامل بصیرت" ہوگا، اس طرح "وَاقْتُلُوهُمْ حیث ثقفتموهم" کا مطلب یہ ہوگا کہ "جہاں تم ان پر قابو پالو اور جنگی نقطۂ نظر سے ان کا قتل وہاں مناسب ہو تو انھیں جانے نہ دو، ضرور قتل کر ڈالو" "وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ" میں اشارہ مہاجرین کی طرف ہے کہ ان کے وطن مکہ معظمہ سے انھیں نکالا گیا تھا، ارشاد ہے کہ جو مشرکین تم سے جنگ کرتے ہیں اور اس سے پہلے انھوں نے تمھیں تمہارے وطن سے نکال دیا تھا، تمھیں گھر سے بے گھر بنا دیا تھا انھیں تم بھی نکال باہر کرو۔

"وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" (اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین ہے)۔ "فتنہ" سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔ اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ "فتنہ" کے اصل معنی آزمائش اور ابتلاء کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مومن کا اس کے دین کے بارے میں ابتلاء، اور اس حد تک کہ وہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد شرک میں مبتلا ہو جائے اس کے حق میں اس سے زیادہ سنگین اور زیادہ نقصان دہ ہے کہ وہ اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے قتل کر دیا جائے۔ مجاہد، قتادہ، ربیع، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ سے منقول تفسیر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ" آیت کی قراءت دو طرح کی گئی ہے۔ مدینہ اور مکہ زاد اللہ شرفہا کے اکثر قاری تو اسی مشہور و معروف قراءت کے مطابق پڑھتے ہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! مسجد حرام کے قریب (حدودِ حرم میں) مشرکوں کے ساتھ جنگ کی ابتداء نہ کرو۔ لیکن اگر وہ ابتداء کریں اور اقداماً جنگ چھیڑ دیں تو تم اپنا بھرپور دفاع کرو اور انھیں قتل کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر اور برے اعمال کا بدلہ دنیا میں قتل اور آخرت میں ہمیشہ کی رسوائی مقرر کر دیا ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے اسی کے مطابق تفسیر نقل ہے۔ آپ حضرات کی رائے ہے کہ پھر یہ حکم اس کے بعد کی آیت "اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے"، سے منسوخ ہو گیا، یعنی بعد میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا کہ حدود حرم میں بھی آپ مشرکین مکہ سے جنگ کر سکتے ہیں تاکہ وہ کلمہ توحید کا اقرار کر لیں۔

اسی قراءت کی بناء پر دوسرا قول یہ ہے کہ آیت کا حکم منسوخ نہیں ہے، بلکہ یہ آیت بھی دوسری آیتوں کی طرح محکم ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آں حضور ﷺ کو آیت میں حکم ہے کہ اگر مشرکین حدود حرم میں آپ سے جنگ کی ابتداء کریں تو آپ بھی وہیں اپنا دفاع کریں اور انھیں قتل کرنے سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ہچکچائیں، لیکن جنگ کی ابتداء حدود حرم میں آپ کی طرف سے نہ ہونی چاہیے۔

Marfat.com

آیت کی قرارت کوفہ کے اکثر قاری اس طرح کرتے ہیں " لَا تَقْتُلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يَقْتُلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قَتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ "، مطلب یہ ہے کہ حدود حرم میں قتل کی ابتدا تم نہ کرو، جب تک وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کریں۔ اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قرارت منقول ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اگر آیت کی قرارت کے مطابق سب مسلمان پہلے قتل ہولیں، پھر کون کفار کو قتل کرے گا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص بھی قتل ہوجاتا یا اسے چوٹ آجاتی تو اس کی قوم والے جمع کے صیغے کے ساتھ کہتے کہ " قُتِلْنَا ، ضُرِبْنَا " (ہمیں قتل کردیا گیا، ہمیں مارا گیا)۔

میرے نزدیک راجح قرارت پہلی ہی ہے، اور یہ کہ یہ حکم اس کے بعد کی آیت سے منسوخ ہوگیا تھا۔ اس کی تائید میں بعض اقوال ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ ایک اور روایت میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

" فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ " یعنی کفار جو آپ سے جنگ کرتے ہیں، اگر اپنی اس جنگ بازی اور کفر سے باز آجائیں اور صدق دل سے توبہ کرلیں تو اللہ ان لوگوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے جو ان میں سے ایمان لائیں، شرک سے توبہ کرلیں اور اپنے تمام پچھلے گناہوں کے لیے اللہ کی طرف رجوع کریں، اور اللہ اپنے افضال و انعامات کے ذریعہ آخرت میں ان پر رحم کرنے والا ہے، آخرت میں انھیں بھی وہ سب کچھ ملے گا جو طاعت گذار بندوں کو ملتا ہے۔

" وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ " اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ جو مشرکین آپ سے جنگ کرتے ہیں ان سے آپ بھی جنگ کیجیے، تاکہ فتنہ باقی نہ رہے " فتنہ " سے مراد وہی " اللہ کے ساتھ شرک " ہے، یعنی یہاں تک کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، بتوں کے پوجنے کا سلسلہ ختم ہوجائے اور عبادت و طاعت صرف اللہ کی ہونے لگے۔ قتادہ، مجاہد، سُدّی، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے " فتنہ " کا معنیٰ " اللہ کے ساتھ شرک " ہی نقل ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔ " وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ " میں " دین " سے مراد طاعت و عبادت ہے، یعنی اللہ نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے اور جن سے روکا ہے، ان سب میں اس کی طاعت اور اسی کی عبادت ہو، کلام عرب میں بھی یہ لفظ طاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تفسیر میں روایت ہے کہ " یہاں تک کہ اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کی جائے " یعنی سب لوگ کلمہ توحید کو مان لیں، اسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی اور اسی کی طرف لوگوں کو بلایا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ کلمہ توحید کا اقرار کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، جب وہ لوگ یہ سب امور کرنے لگیں پھر ان کا خون اور ان کا مال مجھ سے محفوظ ہے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ قتادہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

" فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ " یعنی جو کفار آپ سے جنگ کرتے تھے اگر وہ اپنی جنگ بازی سے باز آجائیں اور تمہارے دین کو قبول کرلیں، جو امور اللہ نے ان پر فرض کیے ہیں ان پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا ہوجائیں اور بتوں کی عبادت چھوڑ دیں تو تم بھی ان سے قتال و جہاد بند کردو، کیونکہ ظالموں کے سوا اور کسی پر سختی مناسب نہیں۔ یہ " ظالم " وہی ہیں ..... جو اپنے حقیقی خالق کی عبادت چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہیں اور اللہ کے ساتھ انھیں شریک ٹھہراتے ہیں۔ آیت میں

Marfat.com

"عدوان" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی ظالموں کے سوا اور کسی پر ظلم و تعدّی مناسب نہیں، گویا ظالموں پر ظلم جائز ہے؟ مفہوم یہ نہیں ہے، بلکہ چونکہ ان کی طرف سے ظلم تھا، اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جیسا معاملہ وہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں تم بھی انھیں ویسا ہی بدلہ دو، اور اسی کی تعبیر "عدوان" سے کی گئی ہے۔ وہ ظالم ہیں، حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، تم بھی اس کا بھرپور بدلہ دو اور ان کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو تم عام حالات میں نہ کرتے۔ یہ بدلہ حقیقتاً ظلم نہیں ہے، لیکن بلا کسی وجہ کے اگر ابتداء میں اس طرح کا معاملہ کیا جائے تو ظلم ہے۔ بدلہ کے لیئے اس طرح کی تعبیر دوسرے مواقع پر بھی استعمال کی گئی ہیں، مثلاً ارشاد ہے کہ "اللہ ان سے مذاق کرے گا" وغیرہ، حالانکہ اللہ حقیقتاً ان سے مذاق نہیں کرے گا، بلکہ چونکہ وہ دنیا میں اللہ کے احکام کا مذاق بناتے ہیں، اس لیئے قیامت کے دن اللہ نے اپنے بدلہ اور کفار کو اس عمل کی سزا کے لیئے یہ تعبیر اختیار کی۔ ہم نے آیت کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کی تائید قتادہ، ربیع اور عکرمہ رحمہم اللہ کے اقوال سے ہوتی ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ" کا مفہوم یہ ہے کہ "پس صرف انھیں سے جنگ کی جائے جو جنگ کریں"۔ مجاہد اور سدّی رحمہما اللہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ سُدّی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ان سے بھی اسی طرح پیش آؤ جس طرح وہ تم سے پیش آتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز، ظلم کو پسند نہیں کرتے، وہ ظالموں ہی کے لیئے کیوں نہ ہو۔ بصرہ کے بعض اہلِ عربیت نے "فَاِنِ انْتَهَوْا" کے متعلق کہا ہے کہ یہ اصل میں "فَاِنِ انْتَهٰی بَعْضُهُمْ" تھا، یعنی اگر ان میں سے بعض باز آجائیں تو اب تمہاری لڑائی صرف ظالموں سے رہے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ "اِنْتَهَوْا" سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ہی باز آئیں گے لیکن بعض اہلِ بصرہ اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بڑا معاف کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے، اور سختی صرف انھیں لوگوں پر مناسب ہے جو ظالم ہیں اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے"۔

ایک قابلِ مطالعہ کتاب

آلاتِ جدیدہ

از مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مد ظلہ

اس کتاب میں نئی ایجادات مثلاً لاؤڈ اسپیکر، گراموفون، ریڈیو، فوٹو گرافی، انجکشن اور اس کے علاوہ بہت سے آلاتِ جدیدہ کے استعمال اور ان کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذان اور نماز جائز ہے یا نہیں؟ ریڈیو پر قرآن مجید کی تلاوت، تفسیر یا دوسری دینی باتیں بیان کرنے کا کیا حکم ہے۔ گراموفون کی شرعی حیثیت، ٹیلی فون، ریڈیو کی خبر کا حکم۔ ان پر اگر کسی نے آیتِ سجدہ کی تلاوت کی تو کیا سننے والوں پر سجدہ واجب ہو جائے گا؟ سینما اور فوٹو گرافی کا حکم، انجکشن کے احکام، کیا انجکشن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؟ یہ اور اس کے علاوہ "آلاتِ جدیدہ" سے متعلق اور بہت سے احکام دلائل عقلی و نقلی کے ساتھ پوری تفصیل سے آپ کو اس کتاب میں ملیں گے۔ یہ کتاب ہر خاص و عام کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے اور سب کے لیئے بہترین رہنما ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے

ملنے کا پتہ: "بیت الحکمت" دیوبند (یو۔پی)

Marfat.com

نادر کتابیں

نقشِ حیات

خود نوشت سوانح حضرت شیخ الاسلامؒ

جس کے پہلے حصہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان، ابتدائی زندگی، تعلیم، دارالعلوم دیوبند میں داخلہ اور شیخ الہندؒ سے قلبی تعلق اور مسلمانانِ ہند اور اکابر علماء ہند کا انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کی مکمل تفصیل۔

کتاب کا دوسرا حصہ وہ بیش بہا مجموعہ ہے جس میں اسلامی ریاستوں پر دول یورپ کی مسلسل یورشیں، استخلاصِ وطن کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ، حضرت سید احمد شہیدؒ کا جہادِ حریت، ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ میں علماء و مشائخ کا حصہ، ریشمی خطوط کی انقلابی تحریک، اس کے رفقاء کار، ہندو افغانستان میں اس کے اثرات و نتائج، اسارتِ مالٹا، مقدمہ کراچی وغیرہ کی ایک مستند تاریخ ملے گی۔ قیمت جلد اول مجلد چھ روپے بلا جلد پانچ روپے۔ قیمت جلد دوم مجلد چار روپے آٹھ آنے۔ بلا جلد تین روپے آٹھ آنے۔

مکتوباتِ شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے فقہی، سیاسی اور اقتصادی و روحانی مسائل اور پچاس سالہ تاریخ کے منتشر جواہر پارے، ملکی خیالات، افکار رسائل کا عظیم الشان مجموعہ جو اس قدر دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کرنے سے پہلے آپ کو چین نہیں آئے گا اور مطالعہ کے ساتھ آپ کا دامنِ طلب بھی علمی جواہر پاروں سے مالامال ہوتا رہے گا۔ کاغذ اعلیٰ قسم، کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ان خوبیوں کے باوجود قیمت مناسب۔

جلد اول مجلد سات روپے — بلا جلد چھ روپے
جلد سوم ،، پانچ روپے آٹھ آنے — ،، چار روپے آٹھ آنے
جلد دوم مجلد سات روپے — بلا جلد چھ روپے
جلد چہارم — زیر طبع

ملنے کا پتہ: بیت الحکمت دیوبند

Marfat.com

الشہاب الثاقب

اہلِ بدعت کے اعتراضات کا جواب، اکابرینِ دیوبند کی عبارتوں کی صحیح توضیح، حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

ارشاداتِ شیخ الاسلام

قطب العالم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ کے گرانقدر مضامین، خطبات اور تقریروں کا قابل قدر مجموعہ۔ روحانیت، سیرت مبارکہ، اصلاحِ معاشرت، مسلمانوں کی ملی اور اجتماعی ضرورتوں کے متعلق بصیرت افروز، روح پرور، بلند پایہ، پرمغز علمی مضامین کا عجیب وغریب گلدستہ جس میں ذکر، احسان وتصوف، استغفار، رموزِ عشق اور لطائفِ حج وزیارت، جمالِ مومن یا اسلامی یونی فارم، دعوتِ عزم وعمل، جلسہ ہائے سیرت کا مقصد، اسلام اور فریضہ حج، سیرتِ پاک کا ازدواجی پہلو، معراجِ جسمانی اور سائنس وفلسفہ، تعلیمِ دین، تلاوتِ قرآن مجید اور ترجمہ قرآن مجید کی اہمیت، کردارِ مسلم اور روحِ جمہوریت، جمعیۃ علماء ہند کے کارنامے اور نصب العین وغیرہ رسائل یک جا جمع کر دیئے گئے ہیں حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کا بہترین ذخیرہ ہے۔ قیمت مجلد تین روپے پچاس پیسے۔ بلاجلد تین روپے۔

ایمان وعمل

یہ رسالہ مودودی صاحب کے اس نظریہ کی تغلیط میں تحریر فرمایا کہ فرائض کا ترک کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا مدنی رحؒ نے اس رسالہ میں مستند روایات سے ثابت کیا ہے کہ فرائض کا تارک اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب گنہگار ضرور ہوتا ہے مگر دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ مع اعتراضات وجوابات مفصل تحریر۔ قیمت ایک روپیہ۔

تاریخ الاسلام کامل ۳ حصے

ازحضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرتب دینی نصاب وسابق ناظم جمعیۃ علماء ہند۔ اس کے مطالعہ سے آپ اور آپ کے عزیز اپنے پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی ومدنی زندگی اور صحیح اسلامی واقعات کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک وپاکیزہ اخلاق وعادات اور اسلامی تہذیب سے روشناس ہو سکیں گے۔ قیمت صرف دو روپے چھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ "بیت الحکمت" دیوبند

Marfat.com

فتاوی دار العلوم دیوبند مکمل مبوّب

فقہی ترتیب والا جدید ایڈیشن!

دار العلوم دیوبند کے صد سالہ دور کا عظیم شاہکار، پیدائش سے لیکر موت تک کے مسائل پر

حاوی بے نظیر مجموعہ، ڈھائی ہزار سے زائد ایسے مسائل جو عموماً مفصل اور عبارات فقہیہ کے ساتھ مدلل ہیں

مُرتب :- حضرت مولانا محمد اکمل صاحب سابق رفیق دار الافتاء دار العلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند عالم اسلام کا وہ عظیم الشان اور سب سے بڑا مرکز ہے جس کی شہرت اور عظمت دنیا کے ہر ملک میں پھیلی ہوئی ہے جو محتاج تعارف نہیں، اسی طرح اس کے فتاوے کو جو مقبولیت اور اعتماد تام حق تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے وہ کسی مسلمان پر مخفی نہیں۔ ہند و بیرونِ ہند، عوام و خواص، پنچایتوں اور عدالتوں میں دیوبند ہی کا فتویٰ اپنی شان مرکزیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن مانا جاتا ہے۔ الحمد للہ اکابر علماء کی یہ محنت شاقہ عامۃ المسلمین کے فائدے کے لئے کتابی شکل میں "فتاویٰ دار العلوم" کے نام سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اب صرف پہلی مرتبہ یہ کتاب اپنی شایانِ شان اور ظاہری و باطنی خصوصیات نیز پورے حقوق کی ادائیگی کے شائع ہو گئی ہے، اس مختصر اعلان میں تمام خصوصیات نہیں آسکتیں اس لئے چند اہم خصوصیات تحریر ہیں، ملاحظہ فرمائیے (۱) اس فتاوے میں دو سلسلے ہیں ایک کا نام "عزیز الفتاویٰ" جو مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے تحریر فرمودہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے، دوسرا "امداد المفتیین" جو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی دار العلوم دیوبند کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ (۲) اس جدید ایڈیشن کو فقہی ترتیب کے مطابق مرتب کراکر شائع کیا گیا ہے تاکہ کسی بھی مسئلہ کے نکالنے میں کوئی دقت یا دشواری نہ ہو، اور بآسانی مطلوبہ مسئلہ نکل آئے (۳) لاؤڈ اسپیکر (آلہ مکبر الصوت) سے متعلق مسئلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی دار العلوم نے حال ہی میں علمائے دیوبند و دیگر علماء امت کی تحقیق و آراء کے ساتھ تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کو اس ایڈیشن میں شامل کرا دیا گیا ہے۔ (۴) اس میں عموماً ایسے فتوے ہیں جو مفصل اور عبارات فقہیہ کے ساتھ مدلل ہیں اکہ علماء و طلباء اور اہلِ فتویٰ کے لئے بھی مفید ہوں۔ (۵) فتاویٰ دار العلوم کی پہلی جلد میں دار العلوم دیوبند اور اس کے فتاویٰ کی مختصر تاریخ درج ہے۔ (۶) فتاویٰ کی ہر جلد کے شروع میں فہرست مضامین بھی لگائی گئی ہے، جس سے مسائل کا نکالنا اور بھی سہل ہو گیا ہے (۷) کتاب فتاویٰ کی اہمیت کے باعث اس کی مکرر صحت کرائی گئی ہے اور صحت ثانی استاد الاساتذہ حضرت مولانا سید حسن صاحبؒ مدرس دار العلوم دیوبند سے کرائی گئی ہے (۸) کتابت۔ طباعت اور کاغذ سب معیاری ہے ٹائٹل خوشنما، دیدہ زیب جس میں دار الافتاء دار العلوم کا فوٹو بھی شامل ہے۔ غرضیکہ اس ایڈیشن میں ضروری اضافوں حواشیوں اور صحت میں بہت زیادہ اہتمام کے باعث اس کی افادیت و خصوصیات میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ اب بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فتاویٰ دار العلوم فقہی معلومات کا عمدہ اور مستند ذخیرہ ہے۔ جو طلباء کے لئے شفیق استاد۔ علماء کے لئے بہترین مشیر اور عوام کے لئے ماہر مفتی کا کام دینے والا ہے۔ الحاصل زندگی کے ہر شعبہ کی تمام ضروریات سے متعلق مسائل کا یہ عظیم ذخیرہ اس قابل ہے کہ تمام مدرسوں، خانقاہوں۔ لائبریریوں اور ہر مسلم گھرانے میں برائے مطالعہ رکھا جائے۔ ہدیہ مکمل سیٹ اکیس ۲۱ روپے۔

بیت الحکمت ـــــ دیوبند (یوپی)

Marfat.com

صرف پہلا پارہ غیر ممبران کو بھی رعایتی قیمت یعنی عہ میں دیا جاتا ہے

تفسیرِ مدارک کا

اردو ترجمہ

تفسیری لائن میں ایک ٹھوس اقدام، قرآنیات کی کڑیوں میں سے ایک اہم اور خوبصورت کڑی یعنی تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ

چند خصوصیات

(۱) سلف صالحین کے مذاق کے مطابق قرآن فہمی کی مکمل اور جامع کوشش (۲) احادیث کے ذخیرے سے قرآن کو حل کرنے کی سعی مشکور (۳) اکابر امت کے قطعی فیصلوں کا ایک گرانمایہ انبار (۴) لغت و ادب کی مصفّٰی چاشنی کا آمیزہ (۵) فرقہ ہائے باطلہ کی غلط تشناوری کے بالمقابل عقائد صحیحہ کا ساحل مراد (۶) جابجا قرآن سے ماخوذ احکام و مسائل، فقہی ژرف نگاہی کے سنہرے نقوش (۷) صوفیائے ہند کی محبوب تفسیر جو صدیوں ہندوستان کی خانقاہوں میں سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی رہی (۸) فقہ حنفی کی کامیاب ترجمان جس نے حنفیت کی پُرشکوہ عمارت کو قرآن سے مضبوط تر کر دیا (۹) جابجا مترجم کے قلم سے وہ حاشیے اضافے، جو قرآنیات کا نچوڑ، سالہا سال کی کاوش، فکر و نظر کے انمول موتی، اور سینکڑوں تفاسیر سے منتخب دُرہائے شاہوار ہیں (۱۰) عربی کے پُرشوکت اسلوب کو اردو کے جاذب و پُرکشش لباس میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ ترجمہ مستقل تفسیر نظر آئے گا ——— انھیں عظیم ترین خصوصیات کی بنا پر اس کا اردو ترجمہ قرآنیات کے ماہر، دار العلوم میں تفسیر کے کامیاب استاذ، اور تراجم و تفاسیر کے شہرۂ آفاق مصنف حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب استاذ دار العلوم دیوبند ابن حضرت العلّامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔

آپ کے تعاون کی صورت

یہ کہ آپ اس اہم دینی خدمت کے لئے صرف ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کرکے ممبر بنجائیے ممبران کی خدمت میں ہر ماہ "تفسیر مدارک" اردو کا ایک پارہ بذریعہ وی، پی روانہ کیا جائے گا۔ ایک پارہ کا عام ہدیہ دو روپے ہوگا، لیکن ممبران کو سوا روپے (عہ) میں دیا جائے گا۔ ہر پارہ پر ڈاک خرچ ۸۵ نئے پیسے آئے گا۔ لیکن اگر پانچ یا اس سے زیادہ حضرات ایک ساتھ ملکر وی، پی منگائیں گے تو اوسطاً ہر پارہ پر ڈاک خرچ صرف آدھے پڑے گا۔ ایک پارہ کی ضخامت اوسطاً سو صفحات ہوگی۔ سائز ۲۰×۳۰ کاغذ عمدہ گلیز، کتابت و طباعت عمدہ اور روشن — آج ہی خود ممبر بنجائیے اور دوسروں کو بھی ممبر بنائیے، مزید تفصیلات کے لئے اس پتہ پر لکھیئے!

خضر راہ بک ڈپو - دیوبند - یوپی

پاکستانی خریدار حضرات

حسب ذیل پتہ پر ایک روپیہ فیس ممبری اور دو روپے قیمت پارہ مع ڈاک خرچ روانہ کرکے رسید (ڈاک خانہ) ہمارے پتہ پر بھیج دیں، پارہ ان کے نام روانہ کر دیا جائے گا۔ اور ممبر بننے کے بعد آئندہ صرف دو روپے بھیج کر پارہ منگاتے رہیں گے۔

پاکستانی پتہ: ——— مولانا محمد صاحب انوری تعلیم القرآن سنت پورہ لائل پور (مغربی پاکستان)

Marfat.com

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے، خیر و برکت والی ہے

تفسیر ابن جریر اردو

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظهور الباری اعظمی

ناشر

بیت الحکمت دیوبند (یوپی)

Marfat.com